بہترین ادب

[illegible]

ترتیب دینے والے :-

غلام ربّانی تاباں

گوپال متل

کمال احمد صدیقی

اور

پرکاش پنڈت

مکتبۂ شاہراہ • دہلی

پہلی بار

قیمت چار روپے

(لکھنّہ لیتھو پریس دہلی)

عوام کے نام ـــــــــــــــــــــــــ

ترتیب

مقالات

منظومات

افسانے خاکے

پیش لفظ

سنہ ۱۹۴۹ء کے ادب کا انتخاب آپ کے سامنے ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے طور پر اس امر کی انتہائی کوشش کی ہے کہ یہ انتخاب زیادہ سے زیادہ نمائندہ ہو۔ اچھے لکھنے والوں کا نہیں بلکہ اچھی چیزوں کا — اس مقصد کے حصول کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ صرف مشہور مشہور رسائل کی ورق گردانی پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے تمام ترقی پسند ہفت روزہ جرائد پر بھی نظر ڈالی جائے یہ کوشش بیکار نہیں گئی اور اس طرح ہمیں بعض ایسی اچھی چیزیں مل گئیں جو بصورت دیگر ہماری نظروں سے اوجھل رہتیں۔

انتخاب کے وقت ہم نے ہندوستان اور پاکستان میں کوئی امتیاز نہیں کیا اور پچاس فیصدی کے اصول پر عمل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا کیونکہ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے یہ ایک ناقابل تقسیم ورثہ ہے تخلیقی ادب پر ہندی یا پاکستانی چھاپ نہیں لگ سکتی۔ اردو ادیبوں کی یہ بڑی ہی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس معاملہ میں سرخرو رہے اور ان کے دامن ملکی یا ملی تعصب کے دھبوں سے پاک ہیں۔

اگر تمام تر غیر جانبداری کے باوجود اس انتخاب میں ہندوستانی ادیبوں کی نگارشات کا تناسب زیادہ ہے تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اچھا لکھنے والوں کی تعداد ہندوستان میں زیادہ ہے اور ان کی تخلیقی سرگرمیوں کی رفتار بھی مدھم نہیں پڑی۔ اس بات سے ہم بجا طور پر خوش ہیں۔ البتہ ان "خوش فہموں" کو اس سے ضرور مایوسی ہوگی جو بزعم خویش یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہندوستان سے اردو کا خاتمہ ہوگیا۔ ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ زبانیں اس طرح نہیں مٹا کرتیں۔

ادھر پاکستان میں بھی اردو کے ادیبوں کی سرگرمیاں ہر لحاظ سے اطمینان کا موجب ہیں۔ ان لوگوں نے ثابت کر دیا کہ شعرِ اردو کے نئے ہر زمین سازگار ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جہاں ایک گروہ کو ہندوستان میں اردو کا مستقبل مخدوش نظر آتا تھا وہاں دوسرا گروہ اس تشویش میں مبتلا تھا کہ اردو پاکستان میں شاید ہی پنپ سکے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان دونوں گروہوں کے اندیشے غلط ثابت ہوئے اور اردو ہند اور پاکستان دونوں کے عوام کی چہیتی بنی رہی۔

دوسری زبانوں کے ادیبوں کے ساتھ اردو ادیبوں نے بھی اپنے دَور کے سماجی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور اس معاملے میں انھوں نے بڑی ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے۔ ۱۹۴۹ء تو اس سلسلے میں یادگار سال ہے۔ ہمارے کتنے ساتھیوں کو اس سال جیل میں ٹھونسا گیا۔ مگر قید و بند کی مصیبتیں اور حکومت کی سختیاں ان کے عزائم کو متزلزل نہ کر سکیں۔

یہ انتخاب اس لحاظ سے اور بھی مفید ہے کہ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا کاروانِ ادب کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے اور اب کونسی منزل میں ہے ؎

سُرخیٔ خارِ مُغیلاں یہ پتہ دیتی ہے
کہ یہاں سے ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

(ادارہ)

مقالات

احتشام حسین
رام بلاس شرما
عبد العلیم
محمد حسن
ممتاز حسین

رام بلاس شرما

ہندی۔ اُردو۔ ہندوستانی کا مسئلہ

ہندی، اردو، ہندوستانی کا مسئلہ یہ ہے کہ ان میں سے کون سی یا کتنی زبانیں ہندوستان کی قومی زبان بنائی جائیں۔

صرف ہندی کو اس علاقہ کی زبان بنانے کی تائید میں یہ دلیلیں دی جاتی ہیں:۔

"ہندی ایسی زبان ہے جسے عوام بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ صرف ہندوؤں کی زبان نہیں ہے بلکہ اسے مسلمان عوام بھی سمجھ سکتے ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس میں فارسی کے لفظ ملا دیئے اور اس انداز تحریر کو وہ اردو کہنے لگے۔ یہ بالکل غیر ملکی زبان ہے اور اس سے ہم کوئی واسطہ نہیں رکھ سکتے"۔

ہندی کے وہ حامی جو زیادہ رجعت پرست ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے، جس کی بنیاد ہندو کلچر، ہندو مذہب پر ہے۔ اس لیئے ہندی اور اردو دونوں ان دو قوموں کی زبان نہیں ہو سکتیں۔ جن کا مذہب ہندو مت اور اسلام ہے۔

چونکہ قوم کی بنیاد مذہب پر نہیں رکھی جا سکتی اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ایک قوم دو زبانیں بولے۔ اسٹالن نے قوم کی جو تعریف کی ہے اس سے بات بالکل صاف سے

کہ ہر قوم کی ایک مشترکہ زبان ہونی چاہئے۔ استالن نے آگے چل کر یہ بھی بتایا ہے کہ اگرچہ ہر قوم کی ایک مشترکہ زبان ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ دو قومیں ایک زبان نہ بولیں۔

"ہر قوم کی ایک مشترکہ زبان ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر قوم کی الگ الگ زبان ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ایسی دو قومیں نہیں ہو سکتیں جو ایک ہی زبان بولتی ہوں۔ انگریز اور امریکی ایک ہی زبان بولتے ہیں، لیکن دونوں ایک قوم نہیں ہیں۔ یہی بات ناروے اور ڈنمارک کے لوگوں اور انگریزوں اور آئرلینڈ کے لوگوں کے لئے ٹھیک ہے۔"

(مارکسزم اور مسئلہ قومیت)

استالین کی اس بات سے کہ "ایسی کوئی قوم نہیں جو ایک ہی وقت میں کئی زبانیں بولتی ہو" ہمیں ہندی، اردو، ہندوستانی کے جھگڑے کو طے کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اگر ان زبانوں کے بولنے اور لکھنے والے ایک سے زیادہ قوموں سے تعلق نہیں رکھتے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کے آپس کے اختلافات قومی اختلافات نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں زبانیں بولنے والے ایک ہی قوم کے ہیں اور اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تینوں زبانیں بنیادی طور پر ایک ہی ہوں۔

ہندی اور اردو بنیادی طور پر ایک ہی زبانیں ہیں، اس لئے کہ دونوں کی بنیاد عوام کی بول چال کی زبان پر ہے اور دونوں اس سے بھاگ کر نہیں جا سکتیں۔ اسے عام بول چال کی ہندوستانی کہیں یا کچھ اور، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات اپنی جگہ قائم ہے کہ ہندی یا اردو کا ایک جملہ ہم اس وقت تک نہیں لکھ سکتے جب تک کہ ہم اس ڈھانچے کو استعمال نہ کریں جو عوام کی بات چیت کا ہے۔

استالن نے اس بات کو اچھی طرح صاف کر دیا ہے کہ جب ایک قوم کے عوام کی مشترکہ زبان کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ان کی بات چیت کی زبان ہوتی ہے، انھوں نے لکھا ہے :۔

"آسٹریا میں چک قوم کا رہنا اور پول قوم کا روس میں رہنا ناممکن ہو جائے اگر ان دونوں قوموں کی اپنی اپنی مشترکہ زبان نہ ہو، اسی کے ساتھ روس اور آسٹریا کے ایک دوسرے میں ضم ہونے میں اس لئے رکاوٹ نہیں پڑ سکتی کہ ان میں کئی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں یہاں ہم ظاہر ہے کہ لوگوں کی بول چال کی زبان کا ذکر کر رہے ہیں نہ کہ حکومت کی سرکاری زبان کا۔" (مارکسزم اور مسئلہ قومیت)

عوام کی بول چال کی زبان ہندی اور اردو میں بانٹی نہیں جا سکتی ہندوستانی قوم کی جنتا کی بول چال کی زبان ایک ہی ہے

اردو کے حامی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُردو جنتا کی زبان ہے اور ان کی دلیل صرف اس حد تک ٹھیک ہے جہاں تک وہ یہ کہتے ہیں کہ ہندی کا تصور اس بول چال کی زبان کے بغیر ناممکن ہے جس پر اردو کی بنیاد ہے۔ جہاں تک ہندوستانی کے حامیوں کی دلیل کا تعلق ہے وہ اس حد تک ٹھیک ہے جہاں تک وہ اس کا سنبندھ عوام کی بول چال کی زبان سے دکھلاتے ہیں۔

لیکن ہندی اور اردو دونوں زبانیں ایک نقطہ کے بعد اپنی بنیاد یعنی بول چال کی زبان سے دور ہٹ جاتی ہیں۔ یہی حال ہندوستانی کا ہوتا ہے جب وہ دونوں میں ایک زبان سمجھی جاتی ہے یا دونوں کو ملا کر اس کا نام ہندوستانی رکھا جاتا ہے۔ اس طرح ہندی اور اردو کی بنیاد اگرچہ ایک ہے لیکن دونوں کا ڈھانچہ الگ الگ ہے۔ ہمیں اس کا پتہ چلانا چاہئے کہ اس

فرق کا سبب کیا ہے؟

ہندی اور اردو میں یا بول چال کی ایک ہی زبان کے دو اسٹائلوں میں فرق کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ برطانوی سامراج کی حکمرانی کے دور میں ہمارے عوام کی سماجی ترقی نہایت غیر مساوی طور پر ہوئی ہے۔

ہندوستان پر بیرونی سرمایہ چھائے رہنے کی وجہ سے جنتا کی سماجی اور کلچرل ترقی میں بڑی سخت رکاوٹ پڑی۔ اس لئے کہ سامراج نے ایک طرف جاگیرداروں کو اپنا ساتھی بنا کر اسے باقی رکھا۔ دوسری طرف ہندوستانی صنعتوں کی ترقی کو روکا۔ معاشی طور پر عوام کو نہایت بے دردی سے لوٹا۔ اپنے مفاد کے لئے چھوٹے کسانوں کی معیشت اسی طرح باقی رکھی۔ زمینداروں کی شکل میں اپنے لئے ایک سماجی بنیاد پیدا کی۔ لوٹ کے لئے جنتا کو کلچرل طور پر بالکل پسماندہ رکھا۔ عوام پر ایک غیر ملکی زبان لاد دی۔ جہاں تک ممکن ہو سکا لوگوں کی اپنی زبانوں اور کلچر کو دبایا اور ترقی نہیں کرنے دی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سامراج نے ہندوستان کے غدار بڑے سرمایہ دار سے سمجھوتہ کر لیا تاکہ دونوں ملکر اس ملک کو لوٹیں۔ اس کا اثر کلچر اور زبان کے میدان میں بالکل صاف ظاہر ہے۔

جنتا اپنا طبقہ واری اتحاد زبان کے میدان میں حاوی نہیں کر سکی۔ مغربی تعلیم، زبان اور ادب نے دانشوروں پر جو اثر ڈالا وہ صرف اعلیٰ طبقوں تک محدود رہا۔ عام جنتا کو اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے سامراج دشمن۔ جاگیردار دشمن اور سرمایہ دار دشمن نقطۂ نظر کو کلچرل مسئلوں میں موثر بنا سکتی۔ اس کے برعکس برطانوی سامراج نے رائے بہادروں، رائے صاحبوں، خان بہادروں اور دوسرے خطاب یافتہ لوگوں کی ایک فوج تیار کر لی، جو

ہندی اور اردو ادب کے لیڈر بن گئے ہیں۔ ہندی اور اردو کی ترقی میں بھی انھوں نے اپنے عوام دشمن اور سامراج دوست نقطۂ نظر کو داخل کر دیا۔

برطانوی سامراج کے زیرِ سایہ نظام حیدر آباد مسلم کلچر اور اُردو کے، اور بیکانیر، الور اور بھرت پور وغیرہ کے راجہ ہندو کلچر اور ہندی بلکہ سنسکرت کے سرپرست بن گئے۔ مہاراجہ الور اور ڈاکٹر کاٹجو (گورنر بنگال) اس کے حامی ہیں کہ سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے۔

برطانوی سامراج نے زبان اور کلچر میں راست اور بالواسطہ طریقہ پر اپنے ساتھیوں کی مدد سے مداخلت کی۔ سیاست کی طرح اس میدان میں بھی اس کی برابر یہ کوشش رہی کہ ہندوستان کے بورژوا طبقہ کو مذہب کی بنیاد پر دو حصّوں میں بانٹ دے۔ چنانچہ وہ زبان اور ادب میں بھی مذہبی جھگڑے پیدا کرتا رہا۔ اس کے زر خرید زبانوں کے ماہروں نے بڑے بڑے سائنٹیفک نظریے پیش کئے کہ زبانوں کی بنیاد نسل اور مذہب پر ہے۔

زبان کے ان سویلین ماہروں میں سب سے اہم گریرسن تھے۔ ہندوستان کے خزانے سے انھیں اور ان کے ماتحتوں کو تیس سال تک روپیہ ملتا رہا کہ ہندوستان کی زبانوں کا تفصیلی جائزہ لیں۔ اِتنی طویل مدّت تک محنت و مشقت کے بعد گریرسن اس نتیجہ پر پہنچے:۔

(۱) "ملک کے بڑے حصّے میں جس میں راجپوتانہ، وسطی ہندوستان اور گجرات بھی شامل ہیں... ... ہر جگہ ہندی یا ہندوستانی دفتری زبان کے طور پر رائج ہے ... ... کوئی شخص بھی جسے ذرا سی بھی سمجھ ہے کئی زبانیں رائج کر کے انتظام میں اُلجھنیں نہیں پیدا کرے گا"

("ہندوستانی زبان کا سروے" تمہید صفحہ ۲۳)

(۲) ہند آریائی زبانیں، قبائلی زبانوں (مثلاً جن کا تعلق دراوڑ دل، منڈا اور تبتی برمن

(غیرہ سے ہے) کی جگہ لیتی جارہی ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۲۹)

(۳) "اسلام نے اردو کو دور دور پھیلا دیا ہے۔ہس ملک میں ایسے مسلمان باشندے ملتے ہیں جن کی زبان وہ نہیں ہے جو اُن کے دوسرے مذہبوں کے ساتھیوں کی ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ دلی اور لکھنؤ کے محاورے استعمال کرنے کی کوشش (اگرچہ بہت محدود طریقہ پر) کرتے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۳۰)

(۴) صرف مسلمانوں کے اردو کے جملوں میں لفظ اس طرح آتے ہیں جس طرح فارسی میں آتے ہیں (۱۳۳) اور

(۵) ملک کے لوگوں میں زبان کی غیر ملکی ساخت کا اتنا سخت احساس ہے کہ ہندوادب اردو جیسی بول چال کی زبان (جو ہندوستانی کی ایسی شکل ہے جس میں فارسی ملی ہوئی ہے) کو اس کے الفاظ کی بنا پر نہیں جانچتے بلکہ اس بنیاد پر کہ اس میں الفاظ آتے کس ترتیب سے ہیں۔"

زبان کے اس جائزے میں اور خاص کر اس کی تمہید میں ایسے بے شمار جواہر پارے ملتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ گریرسن کے زبان کے تجزیہ کی طبقہ داری بنیاد کیا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو بالکل سامراجیوں کی طرح دیکھتا ہے جو نظم ونسق کے مفاد میں کم ترقی یافتہ قوموں کی زبان کو دبانا چاہتا ہے۔ بالکل یہی بات آج کل ہندوستان کے بڑے سرمایہ دار دہرا رہے ہیں۔ گریرسن نے بڑی بے شرمی کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ اسلام نے اردو کو کونے کونے میں پھیلا دیا اور یہ تاریخی حقیقت بھلا دی کہ اردو اسلام کے پیروؤں کے ہندوستان میں آنے اور بسنے کے بعد پیدا ہوئی اور اس نے ترقی کی۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں کہ گریرسن اس کی وجہ کیوں نہ بتا سکے کہ مسلمانوں نے اردو کو

صرف ہندوستان ہی میں پھیلا یا اور دوسرے ملکوں مثلاً مصر، الجیریا، ترکی اور عرب وغیرہ میں نہیں لے گئے۔ گریرسن کے سامنے ایک سوال یہ بھی تھا کہ آخر ہندؤں کی اتنی بڑی تعداد نے اردو کو اپنی بول چال کی زبان کیسے بنا لیا۔ اس کا جواب انھوں نے دیا ہے اور اس کے لئے انھوں نے ایک اور انکشاف کیا وہ یہ کہ مسلمان اردو لکھتے وقت الفاظ کی ترتیب فارسی طریقہ پر رکھتے ہیں اور ہندو سنسکرت کے طریقہ پر ؟

گریرسن کی اس رپورٹ نے ہندوستان اور باہر کی زبانوں کے بورژوا ماہروں پر جو زبردست اثر ڈالا اس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے مسئلہ میں سامراجی مداخلت سے کتنا زبردست نقصان پہنچا ہے اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں اور اسے مٹانا ہوگا۔

برطانوی سامراج نے جاگیرداروں کو اپنے دوست کی حیثیت سے باقی رکھا اور ان کی حفاظت کی۔ احیاءپرستی جاگیردار طبقہ کی خاص آئڈیالوجی ہے۔ جاگیردار طبقہ نے جب کبھی قومی زبان اور ادب میں مداخلت کی تو وہ لازمی طور پر رجعت پرستی اور احیاءپرستی کے تصورات بھی لایا۔ اس نے مذہبی فرقہ داری اختلافات کو ہوا دینے میں مدد دی اور بورژوا طبقہ اسے آڑ بنا کر طبقہ داری اختلافات کو چھپانا چاہتا ہے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی ہر قوم کو مختلف صوبوں اور ریاستوں میں بانٹ دیا۔ اس کی وجہ سے بعض قومیں سیاسی اور کلچرل طور پر متحد نہ ہوسکیں۔

ہندوستانی عوام کی اور ہندوستانی بولنے والے علاقوں کی غیر مساوی کلچرل اور سماجی ترقی کے یہ نہایت اہم اسباب ہیں۔ ان سب چیزوں کی ذمہ داری برطانوی سامراج پر ہے۔ ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کی پالیسی بھی اس کی ذمہ دار ہے کہ جنتا کی مشترکہ سیاسی کلچرل ترقی جمہوری بنیاد پر نہیں ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے قومی لیڈر

جب سامراج سے ملے نہیں تھے اور کبھی اس کی مخالفت کرتے اور کبھی سمجھوتہ تو اس وقت وہ مشترکہ زبان اور کلچر کی بات کہا کرتے تھے۔ جس کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ قومیت پر رکھتے تھے۔ بعض اس کی تائید کرتے تھے کہ ہندوستانی کو قومی زبان بنایا جائے اور یہ دونوں رسم الخط (لیپی) میں لکھی جائے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ پورے ملک کے لئے ایک قومی زبان کے مطالبہ کی طبقہ واری بنیاد کیا ہے۔ اب دیکھیں گے کہ صرف ہندوستانی علاقہ میں مشترکہ کلچر اور زبان کی ترقی میں انھوں نے کیا حصہ لیا۔

ہندوستان کے قومی لیڈر مشترکہ کلچر اور زبان کی باتیں تو خوب بنایا کرتے ہیں لیکن ہر طریقہ پر کوشش اس کی کرتے ہیں کہ اس کی بنیاد جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سامراج سے سمجھوتے کی پالیسی پر چل رہے ہیں اور جنتا کی جمہوری خواہشوں کے خلاف جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے ہر موقع پر سامراج کے خلاف عوام کے انقلابی ابھار کو دبانے کی کوشش کی اس لئے کہ انھیں ڈر تھا کہ یہ انقلابی لہر نہ صرف بیرونی سامراج کو اڑا دیگی بلکہ ان کی طبقہ واری لوٹ کو بھی بہا لے جائے گی۔ دوسری طرف کانگریس کے اندر اور اس کے باہر انھوں نے برابر اس کی کوشش کی کہ مزدوروں اور کسانوں کی طبقہ واری تنظیمیں نہ ترقی کرنے پائیں۔ حالانکہ یہی چیز پورے ہندوستان کے اتحاد، کسی قوم کے اتحاد، اور خاص طور پر زبان اور کلچر کے اتحاد کی ضامن ہے۔ سامراج سے سمجھوتہ بازی اور جنتا کی جمہوری جدوجہد کی مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے لیڈروں نے نہ صرف ہندوستان کی تقسیم میں سامراج کا ہاتھ بٹایا بلکہ عوام میں تاریک پسندی اور شاونیت (جارحانہ قوم پرستی) کے جذبات پھیلائے۔ ایک طرف تو وہ یہ ظاہر کرتے رہے انتہائی فاشسٹ قسم کے رجحانات مثلاً آر، ایس، ایس کے وہ مخالف ہیں۔ دوسری طرف خود انھوں نے انھیں کانگریس کے

اندر لے لیا۔ زبان اور کلچر کے سوال پر انھوں نے مشترکہ کلچر اور مشترکہ زبان کے نعرے لگانے بلند کر دیئے۔ اور وہ کھلے طور پر بدترین احیاء پرستی اور فرقہ پرستی اور مذہبی جذبات کی تائید کر رہے ہیں۔ عوام آج جو اپنے روزگار، جمہوریت اور سچی آزادی کے لیئے جدوجہد کر رہے ہیں اسے وہ پہلے سے کہیں زیادہ سختی سے کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا سب سے پہلا حملہ، عوام کے سیاسی طور پر سب سے زیادہ بیدار حصہ پر ہے جو مزدور طبقہ کی رہنمائی میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ اس حملہ کو آگے اتنا بڑھا رہے ہیں کہ سوائے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سب ہی اس کی زد میں آجائیں گے۔ اس پالیسی سے نہ تو مشترکہ زبان اور کلچر نے ترقی کی ہے اور نہ آئندہ ترقی کر سکتی ہے۔ اگر ان چیزوں نے پچھلے دور میں ترقی کی ہے اور آج ترقی کر سکتی ہیں تو بورژوا قومی لیڈروں کی ان کوششوں کے باوجود ترقی کریں گی۔

صرف یہی نہیں۔ آج قومی لیڈر اس کوشش میں ہیں کہ عوام کو جمہوریت اور سوشلزم کی جدوجہد کے راستہ سے ہٹا دیں۔

زبان کا جھگڑا اور صوبوں کی تقسیم کے متعلق دوسرے جھگڑے اسی لیئے اٹھائے جاتے ہیں تاکہ ان کی مدد سے عوام کو اصلی سماجی مسائل سے ہٹا دیا جائے۔ عوام میں پھوٹ ڈالنے کے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کیئے جاتے ہیں جو سامراج استعمال کیا کرتا تھا تاکہ عوام کی جاگیرداری، سرمایہ داری لوٹ جتنے دن ممکن ہو باقی رکھی جا سکے۔ ان سے اس قسم کی کوئی امید رکھنا سخت حماقت ہے کہ وہ ان مسائل کے حل کرنے میں کوئی حصہ لے سکیں گے۔

کسی اور زمانہ کی نسبت آج کے دور میں صرف مزدور طبقہ اور اس کے ساتھی یعنے کسان اور محنت کش متوسط طبقہ کے لوگ ہی ایسے ہیں جو ہندستان کی ہر قوم کے لیئے مشترکہ کلچر اور مشترکہ زبان تعمیر کر سکتے ہیں۔

کیا آگرہ اور کان پور کی ملوں میں کام کرنے والے ہندو اور مسلمان مزدور دو زبانیں بولتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح یو پی کے کسان جو ایک ہی زمیندار کے ظلم کے نیچے کچلے ہوئے ہیں ایک ہی زبان بولتے ہیں اور ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہیں۔ شہر کے درمیانی طبقے کے محنت کش دفتروں اور اپنے محلوں میں ایک ہی زبان بولتے ہیں اور روزمرہ کی بات چیت میں انھیں کبھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔

اسی طرح ہندو مسلم مزدوروں، ہندو مسلم کسانوں اور ہندو مسلم درمیانی طبقوں کی اپنے اپنے علاقوں میں مشترکہ زبان ایک ہی ہے۔ اس زبان میں ممکن ہے کہ مقامی فرق ہو لیکن اس فرق کی بنیاد ان کے مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے۔ یہ فرق آگے چل کر اس کے ادبی ڈھانچے میں پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم اسے ادبی اور اعلیٰ کلچرل ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ہندی اور اردو کا یہ فرق کہ وہ بنیادی طور پر ایک ہیں، لیکن ان کے ادبی ڈھانچے الگ الگ ہیں، اس تضاد کا عکس ہے جو ہمارے سماجی ارتقا میں پایا جاتا ہے۔

یہ تضاد اس لئے آیا کہ قومی سرمایہ دار طبقہ کو سامراج نے ہندو سرمایہ داروں اور مسلم سرمایہ داروں میں بانٹ دیا اور جاگیرداری نظام اسی طرح باقی رہا۔ سامراج نے جس عمل کو شروع کیا تھا سمجھوتہ پسند ہندوستانی بورژوازی نے اسے مکمل کیا۔ یہ تضاد ایک زبان کی ترقی میں حائل ہوا۔ اور اس نے ایک ہی بنیادی زبان کے دو اسٹائلوں یعنی اردو اور ہندی کی ترقی میں مدد دی۔

یہ کہنا کہ ہندی اور اردو دونوں ایک ہیں یا دونوں کا ادبی ڈھانچہ ایک ہے یا دونوں کی ابتدائی بنیادی شکل یا ہندوستانی، اعلیٰ کلچرل اور تعلیمی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے حقائق سے آنکھیں بند کر لینا ہے اور اس تضاد سے منہ پھیر لینا ہے جو ہمارے

سماجی ارتقا میں پایا جاتا ہے۔ تو پھر کیا یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ ہندی ہندو مذہب والوں کی اور اُردو مسلمانوں کی زبان ہے؟

یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا، اس لئے کہ دونوں کی ادبی اور کلچرل روایتوں میں ایک مشترکہ جمہوری عنصر موجود ہے۔ یہی عنصر ایسا ہے جس کی بنیاد پر بول چال کی مشترکہ زبان ترقی کر کے اعلیٰ کلچرل شکل اختیار کرے گی۔

اگر اردو اور ہندی کو مذہب جدا نہیں کرتا تو پھر اور کون سی چیز جدا کرتی ہے؟ ہندی اور اردو جس قدر بول چال کی زبان سے ہٹتی ہیں اسی قدر وہ ایک دوسرے سے بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اس کی دوری کی بھی دو وجہیں ہیں۔ (۱) قدیم ہندوستان، ایران یا عرب کی بعض ادبی روایتوں کی سختی سے پابندی اور (۲) سنسکرت، عربی اور فارسی لفظ کا استعمال ان کی ادبی شکل میں۔

دنیا کی کسی بھی جدید زبان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قدیم مذہبی رسوم اور روایات کا اثر دن بدن گھٹتا جاتا ہے۔ پرانے تصورات اور روایتیں جو باقی رہ گئی ہیں ان کا مذہبی رنگ اڑ گیا ہے۔ مشترکہ زبان اور کلچر کی ترقی کے لئے زندگی کا مشترکہ ماحول نہایت ضروری ہے۔ اس لئے ایسے اثرات جو خالص ہندوانی یا اسلامی (مذہبی نقطۂ نظر سے) ہیں وہ بتدریج ختم ہو رہے ہیں۔ جیسے جیسے ان تصورات کو پھیلانے والے طبقے مرتے جائیں گے یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ پرانے قصے اور کہانیاں آج کل غیر مذہبی نقطۂ نظر سے اپنی تحریر میں لی جا رہی ہیں اور ہم اپنے ملک کے ادیبوں میں اور خاص طور پر ہندی اور اردو کے بڑے ترقی پسند ادیبوں میں یہ چیز دیکھتے ہیں کہ ایک مشترکہ ادبی اور تہذیبی روایت موجود ہے۔ اس مشترکہ ادبی اور تہذیبی روایت کو عوامی

تھیٹر کی طرف سے خاص طور پر ترقی دی جا رہی ہے جو عام جنتا کے لئے ڈرامے تیار کرتا ہے حالات اسے خود مجبور کرتے ہیں کہ وہ مشترکہ تہذیبی روایتوں کا سہارا لے۔

ہندی اور اردو کے دو ادبی روایتی اسٹائل ایسی بڑی رکاوٹ نہیں ہیں جو دور نہ کی جاسکے۔ اس طرح دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مل کر ایک بن جائیں گی جب کہ بول چال کی مشترکہ زبان ترقی کرے گی جنتا کی اعلیٰ تہذیبی ضرورتوں کے لئے استعمال ہونے لگے گی یہ ترقی خود جمہوری تحریک کی ترقی سے وابستہ رہے گی۔

سنسکرت یا فارسی عربی کی پابندی کا جہاں تک سوال ہے یا دوسرے لفظوں میں ادبی اور اعلیٰ ضرورتوں کے لئے پرانی زبانوں سے الفاظ لینے کا سوال ہے یہ اسی طرح حل ہو سکتا ہے کہ بول چال کی زبان بننے اور اس کے ترقی کرنے کے اصول کو ہم اس کی اعلیٰ منزلوں میں بھی برتیں۔

کیا ہندی اور اردو کی بول چال میں بھی سنسکرت یا عربی فارسی الفاظ کی پابندی کی جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عمل سے ظاہر ہے۔ بول چال کی زبان میں جب کسی کلاسکی زبان کے الفاظ لئے جاتے ہیں تو کیا اصول برتا جاتا ہے؟

۱۔ لفظ لیتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ جس طرح ان زبانوں میں استعمال ہوتا تھا اسی طرح استعمال کیا جائے۔

۲۔ صرف ایسے ہی لفظ لئے جاتے ہیں جو اس زبان کے لئے موزوں ہوتے ہیں، اور جو سنسکرت اور فارسی سے مختلف ہیں۔ یعنی پرانی زبانوں سے ہر لفظ نہیں لیا جاسکتا۔ صرف ایسا ہی لفظ لیا جاسکتا ہے جو اس بول چال کی زبان سے جو پرانی زبانوں سے مختلف ہے میل کھا سکے، اس میں ٹھیک بیٹھ سکے۔

۳۔ جو لفظ لئے جاتے ہیں اکثر ان کا تلفظ بھی بدل جاتا ہے۔ مثلاً سنسکرت کا "اگنی" آگ بن گیا اور "مسوّدہ" مسودہ بن گیا۔

۴۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لفظ لیا جاتا ہے اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں اور بالکل نئے معنی ہو جاتے ہیں۔

۵۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ لفظ پرانی شکل میں باقی رہتا ہے ساتھ ہی اسے ایک نئی شکل اور نئے معنی مل جاتے ہیں۔ مثلاً "چکرا" سے "چکّر" اور "چترا" سے "چتر" وغیرہ۔

۶۔ دوسری زبانوں سے الفاظ لئے جاتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ بول چال کی زبان میں خود اپنے اندر الفاظ بنانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز خاص طور سے مزدوروں اور کسانوں میں ملتی ہے وہ نئے سماجی حالات کے لحاظ سے زبان کو ترقی دینے میں غیر معمولی قابلیت دکھلاتے ہیں۔

یہ چند اصول ہیں جو بول چال کی زبان میں کلاسکی زبان سے فائدہ اٹھاتے وقت برتتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ عام استعمال کے ان قاعدوں کے خلاف چل کر ادبی ڈھانچہ بنایا جائے اور آئندہ کئی برسوں تک باقی رکھا جائے۔

پچھلا تجربہ ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ جب کبھی اس قسم کی کوشش کی گئی وہ آخر میں ناکام ہوئی۔ جب کبھی نئے طبقوں کے ہاتھ میں طاقت آئی تو انھوں نے کچلی ہوئی گنوار زبانوں کی ترقی کے لئے راستہ کھول دیا۔ بعض لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ جنتا کی زبان اور ادبی زبان میں ہمیشہ فرق رہے گا۔ اور اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بول چال کی زبان ممکن ہے کہ کچھ قاعدوں کی پابندی کرے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہی قاعدے ادبی زبانوں میں بھی برتے جائیں۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کا فرق اس لئے پایا جاتا ہے کہ اعلیٰ طبقوں اور عام جنتا کے کلچر میں فرق ہے اس کی بنیاد طبقہ واری فرق پر ہے۔ عوام جب جمہوریت اور سوشلزم کی طرف بڑھیں گے اور یہ فرق پیدا کرنے والے فرقے مٹ جائیں گے تو یہ تفریق بھی مٹ جائے گی۔ یہ فرق آج ترقی پسند ادب میں بھی مٹتا جاتا ہے۔ جب ہم اسے عوام کی جد وجہد کا ہتھیار بناتے ہیں اس کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اس لئے کہ وہ دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

پچھلے دور میں لبرل بورژوا لیڈروں نے ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ زبان کے مسئلہ کو لبرل بورژوا طبقہ کے نقطۂ نظر سے حل کرنا چاہتے تھے وہ سوال کو اس طرح سامنے رکھتے تھے کہ موجودہ ہندی اور اردو کو ملا دیا جائے۔ کیا مشترکہ زبان کو اس طرح پیش کرنے کا طریقہ صحیح تھا (ہندی اردو کے رشتہ میں) ؟

سوال کو اس ڈھنگ سے پیش کرنے کا طریقہ غلط تھا۔ انھوں نے اس سماجی عنصر کو بھلا دیا جو بول چال کی مشترکہ زبان کو اعلیٰ کلچرل زبان بننے سے روکتا ہے اور زبان کی اعلیٰ کلچرل شکل کو حصوں میں بانٹنے کی کوشش شروع کی۔ انھوں نے اس مسئلہ کو جنتا کی سیاسی اور تہذیبی ترقی سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے اسے اس طرح نہیں دیکھا کہ یہ مسئلہ جنتا کی جہالت دور کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ کلچر اور ادب کو عام جنتا تک پہنچانے کا مسئلہ بھی ہے اور یہ دانش وروں کے ایک حصہ سے احیاء پسندی (پرانے زمانے کو لوٹانے کا جذبہ) اور دوسرے رجعت پرست رجحان جنھیں سامراج کے ساتھیوں نے پھیلایا تھا دور کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں ہندو مسلم سوال کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی گئی ؟ جنتا کی جمہوری تحریک کو آگے بڑھا کر نہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں فرقہ واری تناسب قائم کرکے۔ یہی صورت زبان کے مسئلہ میں اختیار کی گئی۔ ایسی زبان جو اعلیٰ تہذیبی ضرورتیں پوری کرسکے۔ لیکن اس کے لئے انھوں نے بول چال کی زبان کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ فارسی یا سنسکرت کی ڈکشنریوں سے لفظ لئے اور یہاں بھی فرقہ واری تناسب کسی نہ کسی طریقہ پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔

ڈکشنری کی مدد سے ہندوستانی بنائی گئی۔ لیکن یہ وہ مقصد پورا نہ کرسکی، جس کے لئے وہ بنائی گئی تھی۔ دو رسم الخط میں ایک ہندوستانی رائج کرکے مسئلہ آج بھی حل نہ ہوسکا۔ اگر دونوں رسم الخط میں جو لفظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور دونوں کو ہندوستانی کا نام دیا جاتا ہے تو اس سے الجھن اور بڑھتی ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کو گالیاں دینے کا سلسلہ بندھ جاتا ہے۔

اگر دو رسم الخط میں ایک ہندوستانی کے معنے ہم یہ نہیں لیتے کہ اردو اور ہندی دو رسم الخط میں، بلکہ ایک عام مقبول زبان دو رسم الخط میں تو بھی اس حل سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہم یہاں اعلیٰ تہذیبی ضرورتوں کے لئے بول چال کی مشترکہ زبان استعمال کرتے وقت ہندی اور اردو کے حقیقی فرق کو نظر انداز کررہے ہیں۔ یہ فرق زمانے کے ساتھ مٹتا جائے گا۔ کتنے عرصہ میں ؟ اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اسے نظر انداز کرنے کے بجائے کتنی جلدی اس کا جائزہ لیتے ہیں اور ایسے طریقۂ کار اختیار کرتے ہیں کہ یہ فرق جلد سے جلد مٹ جائے۔ ایک ایسی ہندوستانی جو اردو اور ہندی دونوں سے آزاد ہو ایک دن میں نہیں بن سکتی۔ اس لئے فوری حل

یہ قبول نہیں کیا جا سکتا کہ ایک رسم الخط یا اردو میں ہندوستانی رائج کی جائے۔

اِس لئے ہندوستانی علاقوں کی زبان کے مسئلہ کا حل صرف ایک رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہندی اور اردو دونوں کو موجودہ شکل میں ساتھ ساتھ رہنے دیا جائے اور اس کا موقع دیا جائے کہ دونوں جلد سے جلد ایک دوسرے میں قدرتی طور پر مل جائیں۔ ہندی اور اردو کا مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو سکتا کہ ایک کے لئے دوسرے کو بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ اس کا ممکنہ حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دونوں قدرتی طریقہ پر ایک دوسرے میں مل جائیں اور یہ عمل جنتا کی بول چال کی زبان ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے زبان کے اوپر کے ڈھانچے میں بھی اسی بول چال کی زبان کے قاعدوں پر پابندی کرنی ہوگی۔ اپنی زبان اور ادب کو جنتا کی جدوجہد سے جوڑنا ہوگا۔ ان کے بغیر زبان اور ادب کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔

دیش کی بورژوا جاگیرداری حکومتیں اتحاد کے نام پر ایک زبان کو دوسری زبان پہ قربان کر دینا چاہتی ہیں اس پالیسی سے اتحاد کی بجائے فرقہ داری نفرت بڑھتی ہے۔ اور مزدور طبقہ میں زبان کے مسئلہ پہ پھوٹ پڑتی ہے اور آج بورژوا لیڈر یہی چاہتے ہیں۔ مولانکر نہایت بے شرمی کے ساتھ اور صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ اقلیتوں کی زبان اور کلچر کو تباہ کر دیا جائے۔ ہندوستان ٹائمز میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے انھوں نے لکھا ہے:۔

"ہم سخت تذبذب میں ہیں۔ اگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آخر میں کسی گروپ کے کلچر اور زبان کو تباہ کرنا ہی پڑے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ گروپ اکثریت کا نہیں بلکہ اقلیت کا ہونا چاہیئے۔"

بورژوا لیڈر واقعی بڑی مشکل میں ہیں۔ لیکن مشکل یہ نہیں ہے کہ کونسی زبان

رہنی چاہیئے، اقلیت کی یا اکثریت کی ؛ سوال یہ ہے کہ اس طبقہ کو کس طرح بچانا چاہیئے جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں ۔ وہ ایسے طبقے کی خدمت کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستانی جنتا کا دشمن ہے اور اس لئے وہ زبان کے مسئلہ پر اقلیت اور اکثریت کا سوال اٹھاتے ہیں ۔ اس قسم کا حل مزدور طبقہ کبھی نہیں مان سکتا اور نہ ہی کوئی ایسا شخص مان سکتا ہے جس میں جمہوریت کا ذرا سا بھی شعور ہو ۔ اس حل کے معنی یہ ہیں کہ زبان کے مسئلہ پر حکمران طبقہ کے مفاد میں جنتا میں پھوٹ پڑے اور خون خرابہ ہو ۔ یہ حکمراں طبقہ سوشلزم اور جمہوریت کی جنتا کی لڑائی کی وجہ سے سخت مشکل میں ہے ۔

بورژوا طبقہ اور جاگیرداروں کے سامنے بحیثیت طبقوں کے کوئی مستقبل نہیں ہے وہ نیم غلامی کے نظام کے مرتے ہوئے طبقے ہیں جو اس سامراج کے ساتھ مر رہے ہیں جس نے انھیں پیدا کیا تھا ۔ یہ مرتے ہوئے طبقے اتحاد، مشترکہ کلچر اور جنتا کی مشترکہ زبان کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ اسی لئے وہ جنتا کے سامنے یہ حل پیش کر رہے ہیں ۔ جو اگر مان لیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ جمہوری جد و جہد کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ رہے ہیں ۔

ہندوستان کے محنت کش عوام منظم مزدور طبقے کی رہنمائی میں ایشیا کی ابھرتی ہوئی جنتا کا حصہ ہیں ۔ یہ وہ طبقے ہیں جو کل کے روشن اور شاندار ہندوستان کے معمار بنیں گے ۔ صرف یہی طبقے ہیں جن کی نظر اس قدر تیز ہے کہ وہ آج کے جھگڑوں کے دھندلکے میں اس اتحاد کو دیکھ سکتے ہیں جو جنتا کی مشترکہ جد و جہد میں آج بھی پیدا ہو رہا ہے ۔ ہندوستان کی جنتا مشکل میں نہیں ہے اس کا مستقبل اس کی آنکھوں کے سامنے صاف اور روشن ہے ۔ اس مستقبل میں مذہب اور فرقہ کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہو سکتی ۔ اس مستقبل میں

زور زبردستی کا اتحاد نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد اس پہ ہوتی ہے کہ ایک طبقہ دوسرے پہ جیتا ہے۔ یہ مستقبل بالکل قریب ہے۔ یہ آج عوام کی جد وجہد کے دوران میں تعمیر ہو رہا ہے۔

اس لئے مزدور طبقہ اور تمام محنت کش عوام کو یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ ہندوستانی کے علاقہ میں ہندی اور اردو دونوں کی یکساں طور پہ حفاظت کی جائے۔ یہ کام ایک مرتے ہوئے طبقے کے سپرد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس کا تصفیہ کرے کہ ایک مشترکہ زبان کس طرح ترقی کرے گی۔ عام جنتا اپنی بول چال کی زبان میں ایکتا پیدا کر رہی ہے اور وہی اپنے علاقہ میں ایک مشترکہ تہذیبی زبان کو بھی ترقی دے گی۔ اسے مطالبہ کرنا چاہیئے کہ دونوں زبانوں کی یکساں طور پہ حفاظت کی جائے تاکہ وہ اپنے طبقہ واری اتحاد کو کلچر کے میدان میں بھی منوا سکے، اور اپنی بول چال کی زبان کو قدرتی اور جمہوری طریقہ پہ ترقی دے کر ہندی اور اردو کو ملا کر ایک زبان کر دے۔ اس حل سے زبان کے مسئلے کے جھگڑے کم ہو جائیں گے، اتحاد کی طاقتیں کافی مضبوط ہو جائیں گی اور بورژوا طبقہ جنتا کو جمہوری انقلاب کی جد وجہد کے راستہ سے ہٹانے کے لئے زبان کے مسئلہ کو کبھی استعمال نہیں کر سکے گا۔

علی سردار جعفری

دسمبر

ممتاز حسین

ماضی کے ادبِ عالیہ سے متعلق

"علم تمہارے لئے بہ منزلہ کھوئی ہوئی بھیڑوں کے ہیں، جہاں سے بھی ملیں انھیں لاؤ۔" (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

ایک ایسے زمانہ میں جب کہ طبقاتی جنگ بہت تیز ہو جاتی ہے تو جذباتی دفوریا نظریاتی کمزوری کے باعث ادبی پرکھ میں غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تصور سیاسی تیز پسندی کا نہیں ہے کیونکہ سیاست تو تیز ہوتی ہی ہے۔ بورژوا نظام کے تضاد جوں جوں ابھرتے جائیں گے طبقاتی جنگ کا تیز ہونا لازمی ہے۔ تاریخ کا تقاضا تو انھیں تضاد کو زیادہ سے زیادہ ابھارنے اور تیز کرنے ہی کا ہے۔ لیکن جب سماجی ارتقا کے قوانین کا اطلاق بہت بھونڈے اور میکانکی طور پر ادب پر کیا جانے لگتا ہے تو نہ صرف ادب ہی کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ انقلابی قوتیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔ مارکسی تنقید میں اقتصادی بنیاد کی اولیت اور طبقاتی جنگ، ادبی جانچ پڑتال کا بہترین آلہ ہے۔ لیکن جب اس آلہ کو باقاعدہ تمام حالات اور علوم کا جائزہ لئے ہوئے میکانکی طور سے استعمال کیا جاتا ہے تو یہی آلہ علم دشمنی اور جہالت کا

حربہ بھی بن جاتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے پہلے اور بعد میں نہ صرف روس ہی میں بلکہ انگلز اور مارکس کے زمانہ میں بھی خود جرمنی میں ایسے ناقدین موجود تھے جو مارکسزم کو ایک میکانکی علم بنا کر ماضی کے ادب کو جانچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر مارکس اور انیگلز دونوں نے ہی اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اسی طرح لینن نے ہرزہ گو معلموں کے خلاف نہ صرف بہت کچھ لکھا ہے بلکہ عملی تنقید کے ذریعے ہماری رہنمائی بھی کی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اپنے ماضی کے ادب کی کسوٹی بناتے وقت ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں۔ قبل اس کے کہ ایک اتنے بڑے مسئلے کو ہاتھ لگایا جائے میں تمہیداً صرف سماجی ترقی کے مفہوم اور کلاسکی ادب کے چند بنیادی مسائل کو پیش کروں گا۔

جسے ہم سماجی ترقی کہتے ہیں اس کا تعلق ترقی کے مختلف سمتوں سے ہے معاشی اور سیاسی ترقی کے ساتھ اگر مادی اور ارضی نقطہ نگاہ اور بنی نوع انسان کی وحدت کا تصور نہ ابھر سکے تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ابھی ہماری ترقی نہ صرف نامکمل ہی ہے بلکہ اس میں کھوٹ بھی ہے۔ کیونکہ سماجی شعور ایک خلاقانہ قوت ہے جو معاشی بنیادوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ اگر سماجی شعور کی بنیادیں مستحکم نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں غلط معاشی نظام کی طرف لے جائیں یا لوٹا دیں۔ یہی خطرہ ہمیں تصنیفات کے فوری اثر ہی کو دیکھنے تک محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے دیرپا اثرات کا مطالعہ بھی لازم کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے کی ادبی تصنیف فوری اثر کے اعتبار سے کمزور ہو لیکن سماجی ترقی میں دیرپا اثرات کی حامل ہو۔ اس حقیقت کا ایک مخالف پہلو بھی ہے۔

یہ بات تو مسلّم ہی ہے کہ ادب اور تہذیب کی ترقی طبقاتی سماج میں ہوئی۔ چنانچہ طبقاتی اثرات کی چھاپ تو ادب اور کلچر دونوں ہی پر ہے۔ لیکن جب ہم اس طرح سوچیں

تو ہمیں سماجی ترقی کے مفہوم کو بھی اپنے ذہن میں رکھنا چاہئے ۔ غلامی کا دور استحصالی نظام کو وجود میں لانے کے خیال سے ایک بُرا زمانہ تصور کیا جاتا ہے لیکن قبائلی نظام کے مقابلے میں اس دور میں انسان نے زیادہ ترقی کی ہے ۔ اس لئے اس دور کا کچھ حصہ ترقی پسندی کا بھی دور رہا ہے ۔ یونان کا تمام علم و ادب اسی دور میں بار آور ہوا اس دور کے علم و ادب نے ترقی اور رجعت دونوں ہی کی نمائندگی کی ہے ۔ کسی بھی دور کی سب چیزیں ترقی پسند نہیں ہوتی ہیں اور نہ انھیں تاریخی تقاضوں کا نتیجہ ہی کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے ۔ ترقی اور رجعت کی روایات ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان رہی ہیں ۔ سماجی ارتقا ترقی کی قدیم روایات آگے بڑھا کر ایک نئی صورت میں تبدیل کرتا رہا ہے ۔ وہ ناقص اور غیر سائنسی روایات کو فسخ بھی کرتا رہا ہے ۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم ہے ۔ اگر بنیادی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ترقی دو لفظوں میں سمٹ آتی ہے ، طریق پیداوار کو بڑھانے اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے اور انسانیت کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں جن قوتوں نے حصہ لیا ہے انھیں ہم ترقی پسند کہتے ہیں ۔ یہ قوتیں مختلف ممالک میں ایک ہی وقت میں اپنے ملکی حالات کے ماتحت مختلف صورتوں میں کام کرتی رہی ہیں ۔ ہم ایک ملک کی مثال کو دوسرے ملک کی میکانکی طور پر لاگو نہیں کر سکتے ہیں ۔ پھر یہ کہ علم و ادب کا رشتہ معاشی بنیادوں کے ساتھ طبقاتی نظام میں اتنا براہ راست نہیں رہا ہے جتنا کہ قبائلی نظام میں تھا ۔ طبقاتی نظام میں تو ان چیزوں نے اکثر و بیشتر ایک بار معاشی بنیاد سے متعین ہو کر اپنی ایک آزاد زندگی بھی اختیار کر لی ہے ۔ اکثر ان کی یہ آزادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ اپنی ترقی کے مخصوص قانون اور منطق بھی بنا لیتے ہیں ۔ ہمیں فکری تحریکوں کو جانچتے وقت نہ صرف

طبقاتی جنگ ہی کو دیکھتا ہے بلکہ ان کے تسلسل، منطق اور قانون کا پتہ بھی چلاتا ہے چونکہ فکری تحریکیں ادب پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں اس لئے ان کا مطالعہ مع ان کی منطق کے بہت ضروری ہے۔ فکری تحریکیں اس لئے بھی اہم ہیں کہ وہ ایک مخصوص عہد کے ارضی نقطۂ نگاہ اور ادراکِ حقیقت کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ ان کی مدد سے ادب سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ادب کی تعریف لینن نے نہ صرف اس طرح کی ہے کہ ادب خارجی حقیقت کا آئینہ ہے بلکہ اس طرح بھی کہ ادب ادراکِ حقیقت میں مدد بھی کرتا ہے انھیں معنوں میں ادب ہماری جسمانی، ذہنی، جذباتی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی مدد سے کسی بھی زمانے کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ یہ تاریخ پورے سماج کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جو حقیقت میں نئے اور پرانے کی جنگ کی تاریخ ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادیب کسی نہ کسی معنی میں نئے کے ساتھ ہوتا ہے اس وقت یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ مکمل طور پر نئے کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جس حد تک نئے دور کی متضاد قدروں کی گنجلک تصویر عوام کے ذہنوں میں جھلکتی ہے۔ ادیب کا ذہن بھی گنجلک ہوتا ہے اس لئے وہ اکثر متضاد باتیں بھی کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ بنیادی اعتبار سے پرانے کے خلاف جنگ کر کے کون سی نئی چیزیں لانا چاہتا ہے۔ اگر وہ صرف ماضی کی چیزیں واپس لانے کی کوشش کر رہا ہے تو ہم اسے رجعت پرست سمجھیں گے۔ خواہ وہ ایک مخصوص عہد کے پرانے پن کے خلاف ہی جنگ کیوں نہ کر رہا ہو۔ میں نے اس چیز کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ جب انحطاطی حکمراں طبقہ اپنے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو بہت سے نئے تصورات کو بھی اپناتا ہے۔ لیکن وہ ان تصورات کو صرف اپنے طبقاتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے اس کی یہ کوشش اصل میں قدیم کو زندہ رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال

اسلامی تاریخ میں امام غزالیؒ کا زمانہ ہے۔ اس وقت اسلام کی شرعی حکومت انحطاط کی مکمل صورت میں تھی۔ شرع اور فقہ پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ دشمنانِ شرع یونانی علوم سے لیس تھے۔ بالآخر امام غزالیؒ کو بھی یونانی علم کلام کو مستعار لینا پڑا لیکن امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے جن مقاصد کے لئے استعمال کیا وہ قطعی رجعت پسند تھے اسے مادی ترقی کے بجائے روحانی استدراک کا ذریعہ بنایا۔ اسلام میں مابعد الطبیعاتی منطق کی راہیں انھیں کی کوششوں سے کھلی ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی مثال علامہ اقبالؒ کی فکری کوششیں ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کی روحانی جمہوریت کو واپس لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں انھوں نے ان ذرائع کو بھی استعمال کرنا چاہا ہے جن سے یورپ میں ترقی ہوئی تھی۔ لیکن ایسے تمام ذرائع کو وہ اپنے مخصوص مقصد کا پابند بھی بنا دیتے ہیں اور یہی چیز ان کے کلام میں تضاد بھی پیدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ مادی ذرائع روحانی مقاصد کے ساتھ ہمنوا نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر انسان عناصر فطرت پر تصرف حاصل کرے گا تو اس کا مقصد صرف مادی ہوگا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اقبال کے کلام کے ترقی پسند اجزاء خود اپنی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ یوں تو علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی بڑا جاندار معلوم ہوتا ہے لیکن جب وہ شریعت یعنی نیابت الٰہی کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی بغاوت کی حدود بھی متعین ہو جاتی ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو شریعت کو ایک سیال تصور بنا کر ہر نئے نظام پر منطبق کر دیتے ہیں۔ شریعت کی نظریاتی بنیادیں بالکل متعین ہیں اور اس کے عمل کی تاریخ ایک لمبے چوڑے دور پر پھیلی ہوئی ہے اگر ہم اسلامی تاریخ کے ایک بہت ہی مختصر سے وقت کو چھوڑ دیں تو یہ ماننا پڑے گا

کہ شریعت کو استحصالی طبقے نے استعمال کیا ہے اور جب تفسیریں لکھنے کا وقت آیا تو تمام ترفقیہوں نے ایسے ہی نکات پیش کئے جن سے حکمراں طبقے کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ بالآخر خلافت (دینی ریاست) ایک ایسا ادارہ بن گیا جس کی مخالفت کو ایک مقدس فریضہ بنا لیا گیا۔

شریعت کی مخالفت اسلامی تاریخ کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اس بغاوت کی ابتدا ان وحدۃ الوجودی صوفیوں نے کی جو یونان کے فلسفہ وحدت الوجود سے متاثر تھے۔ یہ فلسفہ فلاطون کا نہیں تھا بلکہ پلوڈٹینس کا تھا جس نے فلاطون کی عینیت اور دیموقراطیس کی مادیت کو ہم آمیز کرنے کی کوشش کی تھی۔ بغاوت کی اس آواز کو ذوالنون مصری، بایزید بسطامی اور حلاج نے اٹھایا۔ اس کے لئے یہ آواز اٹھانی ہی مشکل تھی، اگر یونانی وحدت الوجود کے فلسفے کو توحید مطلق کے فلسفہ پر برتری حاصل نہ ہوتی۔ توحید مطلق کے فلسفے میں مادہ مخلوق ہے اور ایک مخصوص زمان ومکان کا پابند ہے۔ اس کی ایک ابتدا اور انتہا ہے۔ وہ اپنی صورت پذیری میں قادر مطلق نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا محرک اور خالق ایک دوسری قوت ہے۔ جس طرح اس قوت نے قوانینِ فطرت وضع کئے ہیں اسی طرح سماجک (Science) سوسائٹی کے لئے بھی چند قوانین وضع کر دئیے ہیں۔

وحدت الوجود کے فلسفہ میں مادہ روح کے ساتھ ہم وجود ہے۔ مادہ بھی روح کے ساتھ ازلی اور ابدی ہے۔ مادے کا خالق کوئی نہیں ہے بلکہ مادہ اور روح ایک دوسرے کے لئے جزو لاینفک ہیں، اس طرح انسان کا عمل اور ارادہ مشیت ایزدی میں شامل ہوجاتا ہے۔ اگر انسان کسی چیز کی تخلیق یا تخریب کرتا ہے تو اس میں مشیت کو بھی دخل ہے کیونکہ مشیت کا اظہار مادہ کے توسط یعنی انسانی عمل ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

وحدت الوجودی صوفیوں نے اسی منطق کی بنیاد پر اسلامی اخلاقیات کو سزا و جزا سے آزاد کر کے عمل میں منتقل کر دیا اور ان تمام مذہبی دیواروں کو گرانے کی کوشش کی جو انسانوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھیں۔ اِن اسباب کے ماتحت یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ صوفی عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ وہ درباری زندگی سے گریز کرتے تھے اور انھوں نے اسلامی تاریخ میں دینی ریاست کے قائم ہونے کی مخالفت کی ہے۔ یہ تذکرہ اس لئے کیا گیا کہ صوفیوں نے بظاہر کھل کر کسی عوامی شورش میں حصّہ نہیں لیا۔ لیکن عوامی تحریک کے ساتھ ان کی ہمدردی بالواسطہ شامل رہی ہے۔

جس حد تک یونانی وحدت الوجود کا فلسفہ اور ایرانی گبرو ترسا کے مادی فلسفے کی روایات توحید مطلق کے فلسفے کے ساتھ ہم آمیز ہو کر ہوتی گئیں۔ صوفیوں کے انقلابی پن میں بھی کمزوری آتی گئی۔ اس فلسفے نے پہلی بیعت امام غزالیؒ کے ہاتھوں کی اور دوسری بیعت مجدّد الف ثانی سرہندیؒ کے ہاتھ۔ امام غزالیؒ نے وحدت الوجود کو اس کے مادّی جزو سے بالکل ہی آزاد کر دیا۔ محسوسات کے فلسفے کو خالص وجدانی اور باطنی فلسفہ بنا کر تصوف کو روحانی مشق و مہارت کی چیز بنا دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے شریعت اور طریقت کو بھی ہم آمیز کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح جب مجدّد الف ثانی سرہندی رح نے ہمہ اوست کو ہمہ از اوست میں تبدیل کیا تو مادّے کو بالکل مخلوق ہی کی صورت دیدی اس کے یہ معنی نہیں کہ وحدت الوجود کا بذات خود عینی فلسفہ جو مادّے اور روح کو ہم آمیز کرتا ہے بہت سے معنی میں مہلک ثابت نہیں ہوا۔ ہر چند وحدت الوجودیوں نے مادّے اور روح کی دوئی کو ہم آمیز کرنے کی ناکام کوشش کی، وہ عینیت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے انھیں روح کو فاعل اور مادّے کو مفعول بنانا ہی پڑا یہی وہ سبب ہے کہ اِس فلسفے میں فکر کو

عمل پر ترجیح دی گئی ہے۔ صوفیوں کی زندگی میں تفکر پسندی، خاموشی اور اعتکاف انہیں تصورات کے ماتحت آیا ہے۔ لیکن اس فلسفے کا ایک حسین پہلو بھی تھا۔ صوفیانِ کرام انسان کو عالمِ اکبر تسلیم کرتے تھے اور دنیا میں فطرت میں صرف انسان ہی کی جلوہ گری پر اپنا ایمان رکھتے تھے میر کا ایسا تھا کا ہارا انسان بھی اِس رمز سے واقف تھا ؎

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں اپنے سوائے کس کو معبود جانتے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

یہاں تو خدا کو بندے سے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی کہ بتا تیری رضا کیا ہے جبر و اختیار کا جھگڑا تو صرف اسی وقت باقی رہتا ہے جبکہ ہم مادّے کو مخلوق تصور کریں ۔ یہ کشمکش تو صرف توحیدِ مطلق ہی کی دی ہوئی ہے۔ بھلا سترھویں صدی کا انحطاطی تصوف اس کی زد سے کیوں کر بچ سکتا تھا بالآخر میر کو بھی اپنی خود مختاری کا اعتبار جاتا رہا۔

اسی طرح حلاّج کا فلسفہ بقا باللہ بھی انحطاطی دور میں بالکل ہی ختم ہو گیا تھا صرف فنا فی اللہ کا لفظ یاد رہ گیا تھا۔ حلاّج کے بقا باللہ کے اصول کے مطابق انسان ذاتِ باری کی خلاّقانہ صفات میں ضم ہو کر تخریب او تخلیق پر آمادہ ہوتا ہے۔ علاّمہ اقبال نے اِسی تصور کے ماتحت انسان کو خالق بھی بتایا ہے۔ فنا فی اللہ کا وہ درجہ ہے جب کہ وہ اپنی تخریب کو نئی تخلیق کے لئے فنا کر دیتا ہے۔ چونکہ بقا باللہ میں انسان کے بندہ رہنے کا تصور کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لئے توحیدِ مطلق کے ماننے والوں نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ اسے کفر کے قریب گردانا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان صوفیوں نے زیادہ تر فنا فی اللہ ہی کو رواج دیا۔ پھر یہ کہ جاگیردارانہ نظام کا انحطاط اس خیال کو ہوا دینے میں اور بھی مددگار ثابت ہوا۔ زندگی میں کوئی بھی نئی تخلیق بغیر مادّی علوم کے ناممکن ہے، یہاں اہلِ شرع

اور اہلِ صفا دونوں ہی نے مادی علوم کو ادراک حقیقت سے خارج کر دیا۔ اہل صفا تو محسوسات سے پہلے بھی رہے لیکن اہلِ شرع نے تو اس کی بھی مخالفت کی۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ وحدت الوجودی بنیادی طور پر اگر ایک طرف مظاہرِ فطرت کی وحدت کے قائل تھے تو دوسری طرف کائناتی تخلیق کے مظاہر کی عالمی حیثیت کو مانتے تھے۔ سماج کے بارے میں ان کا یہ تصور نہ تھا کہ فرد نے کسی معاہدے کی بنا پر اپنے اختیارات سماج کو تفویض کئے ہیں۔ بلکہ یہ کہ انسانوں کا سماج اسی طرح ایک عالم ہے جیسے نباتات یا جمادات کی دنیا ہے ان کا سماجی تصور عمرانی نہیں بلکہ عالمیاتی ہے۔ اسی وجہ سے بنی نوعِ انسان کی وحدت کا تصور اس کی شاعری میں بہت قوی ہے۔ غالب کا شعر ہے

بر در ترسے کہ مردم شود انجمن — شود تازہ پیوند جانہا بہ تن

اسی تصور کے ماتحت ان میں انسان دوستی کا جذبہ بھی بہت شدید تھا۔ لیکن چونکہ وہ مادے کے ارتقا، اور اس کے جدلیاتی عمل سے واقف نہ تھے اس لئے سماجی ارتقا کو طبقاتی کشمکش میں نہ دیکھ سکے۔ یہ راز تو یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد ہی آشکارا ہوا۔ پھر ہم اس کی توقع صوفیوں سے کیوں کر کر سکتے ہیں۔

بڑی ضمنی سی بات ہے، لیکن کہہ دینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ یورپ کو پہلی دفعہ گوئٹے نے آفاقی ادب کا تصور دیا ہے اور اسے اتفاق ہی سمجھئے کہ گوئٹے وحدت الوجودی بھی تھا۔ اس گوئٹے کے بارے میں اینگلز نے لکھا ہے۔ "گوئٹے خدا کے تصور کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتا تھا اُسے تو یہ لفظ ہی کسمسا دیتا تھا وہ تو صرف انسانوں ہی کے ساتھ مانوس تھا اس کی یہ انسان دوستی، ادب کو مذہب سے آزاد کر دینے کی کوشش۔ گوئٹے کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ اس اعتبار سے نہ تو ماضی کے بڑے بڑے مصنفین اور نہ شیکسپیئر ہی اس کا

ہم پلہ ہے۔" لیکن میں اسے اتفاق نہیں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ فارسی اور اردو ادب میں تو صرف وحدت الوجودی صوفیوں ہی نے خدا کے تصور کو چیلنج کیا ہے۔ میں فیضی اور غالب کے اشعار پیش کرنا نہیں چاہتا ہوں بلکہ میں مولانا روم کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں جس کی مدد سے آپ کو وحدت الوجود کا فلسفہ بھی سمجھ میں آ جائے گا ؎

می گفت در بیاباں رندِ دہل دریدہ   صوفی خدانہ دارد اونیست آفریدہ

یہاں مولانا نے صاف لفظوں میں وضاحت کر دی ہے کہ چونکہ مادے کا کوئی خالق نہیں ہے اس لئے انسان کا بھی کوئی خالق نہیں ہے۔ یہی منطق حلاج کو انا الحق کی طرف لے گئی تھی۔ اور اس منطق کے ماتحت کتنے صوفی شعرا خاکم بدہن کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں جاگیردارانہ نظام کے زمانے تک انسانی عظمت کے گیت اسی فلسفے کے ماتحت آئے ہیں۔ وہ تمام صوفی شعرا جنھوں نے شریعت کے ہاتھ بیعت کر لیا ہے وہ بھی انسان کی عظمت کے ایک حد تک قائل ہیں۔ لیکن اس سے آگے قدم اٹھانا نہیں چاہتے۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ ایک درمیانی راستہ اصلاح کا اختیار کیا ہے۔ جس حد تک علامہ اقبالؒ حلاج کے فلسفے سے متاثر ہیں، انسان کو حریم کبریا میں لا کر کھڑا بھی کیا ہے لیکن جس حد تک وہ امام غزالیؒ اور سرہندیؒ کے تصوف سے متاثر ہیں۔ مادی نقطۂ نگاہ سے انسانی عظمت کی نفی بھی کی ہے۔ توحید مطلق اور وحدت الوجود کے متضاد سروں کے ملانے ہی کی کوشش میں علامہ اقبالؒ نے خدا سے تعلق کو لامحدود اور محدود دونوں ہی بتایا ہے اور یہی کوشش اجتہاد اور تقلید کے تضاد کو بھی قائم رکھتی ہے ان کا یہ کہنا ہے کہ اجتہاد ترقی کے زمانے میں کرنا چاہا ہے اور تقلید انحطاط کے زمانے میں۔ جب بھی کوئی رہنما انسانوں کو مقام کبریا بتا کر اسے مخلوق کا لقب بھی دے دیتا ہے

تو وہ اسے بندۂ محکوم بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے میں لینن کی تحریر کا اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ "حقیقت میں یہ خدا کا تصور نہ تھا جس نے بیہیا نہ انفرادیت پرستی کو دبایا ہے۔ یہ کام ابتدائی جماعتی زندگی نے کیا ہے۔ خدا کے تصور نے تو ہمیشہ سماجی جذبہ کو کمزور کیا ہے .... خدا کے تصور نے کبھی بھی فرد اور سماج کے رشتے کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ بلکہ مظلوم طبقے کو غلامی کی زنجیروں میں اس عقیدت کے ماتحت جکڑے رکھا کہ حکمراں طبقے پر خدا کا سایہ رہتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ لینن نے جو کچھ لکھا ہے مغرب کی تاریخ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن یہ غلط بھی نہیں ہے کہ ظلِ سبحانی کا تصور تو ہمارے یہاں بھی کارفرما رہا ہے اور یہ تصور صرف توحید مطلق ہی کا جزو بن سکتا ہے۔ وحدت الوجود میں تو اس کی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن توحید مطلق کے فلسفے سے متاثر ہونے کے بعد تو صوفیوں کے یہاں بھی ولیوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا جو یا تو سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے یا پھر ظل اللہ کی مراعات کے محتاج تھے۔ جہاں تک مادّی فلسفے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا تعلق ہے توحید مطلق اور وحدت الوجود دونوں ہی عینی فلسفے ہیں۔ لیکن جاگیردارانہ نظام کی گذشتہ تاریخ میں توحید وجودی نے سیاسی مطلق العنانی، عقائدی کٹرپن اور الہیاتی منطق کے خلاف جو جنگ کی اسے ہم نظر انداز بھی نہیں کر سکتے، اس نے اس جنگ میں ادراکِ حقیقت کے لئے محسوسات کی شرط ٹھہرائی چشم و گوش اور کام و دہن کی لذت کو ابتدائی زینہ سمجھا اور شعر و ادب میں محسوسات کی تمام رعنائیوں کو رچایا ہے، اس نے مصوری، بت تراشی، موسیقی، رقص، شعر و نغمہ کسی بھی چیز کو ممنوع قرار نہ دیا یہ بات دوسری ہے کہ اس نے ہر چیز کو ایک پردہ بنایا۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ یہ پردے

کو کبھی اٹھا نہ سکا۔ کیونکہ انسانی دماغ مادّے سے ماورا تصورات کو ذہن میں لا ہی نہیں سکتا ہے۔ اگر مشرق میں کچھ لوگ حافظ کے دیوان کا مطالعہ حقیقت کے رنگ میں کرتے ہیں تو اس میں کس کا قصور ہے۔ اگر گوئٹے اور ہائنے نے حافظ کو صرف مجاز ہی کے رنگ میں دیکھا تو علامہ اقبالؒ کو تو خوش ہی ہونا چاہئے تھا کہ دنیا کے ایک حصہ پر افلاطونی گوسفندی کی روحانیت کارگر نہیں ہے۔ لیکن وہ اس بات سے بھی مکدر رہتے تھے۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ حافظ کا مطالعہ صرف مذہبی رنگ میں کیا جائے تا کہ مسیحین مغرب اور ایشیائی مسلمان اس کی ایرانی نیگزم کی مخالفت کرے۔ رہ گئی بے ثباتی دنیا کی بات تو اس کی مخالفت تو کوئی بھی ایسا شخص نہیں کر سکتا ہے جو مادے کو مخلوق سمجھتا ہے کیونکہ اگر مادہ مخلوق ہے تو اس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا بھی۔ کم از کم اہل شرع کو تو بے ثباتی دنیا کا گلہ کرنا ہی نہیں چاہئے۔ مسلمان صوفیوں میں تو یہ چیز توحید مطلق ہی کے فلسفے کے ماتحت آئی۔ ورنہ وحدت الوجودی کی آواز تو ہمیشہ یہی رہی ہے۔ "ہم سے پہلے نہ تو ابد ہے اور نہ ہمارے بعد ازل"۔ حلاجؒ

پھر یہ چیز صوفیوں ہی کے ساتھ کیوں منسوب کر دی گئی۔ قصہ یہ ہے کہ ہراکلیٹس کے قول کے مطابق وحدت الوجودی بھی اس بات کو مانتے تھے کہ ہر چیز ہے اور نہیں ہے، یعنی ہر چیز ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

ہر قطعۂ چمن پر ٹک غور سے نظر کر، بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے (میرؔ)

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میرؔ)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں،
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔ (غالبؔ)

شاید اسی سبب سے بہت سے صوفیوں پر حلولی ہونے کا الزام لگایا۔ لیکن ہراکلیٹس کے اس نکتہ کو سائنسی طور پر سمجھنے کے لئے نیچرل سائنس کی ضرورت تھی جس سے ایشیا مدتوں تک محروم رہا۔ ناچار تغیر و حرکت کو فنا کے ساتھ ہم معنی کر دیا گیا۔ یہ توضیح ہے کہ ہر چیز فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ ایک نئی صورت میں بدلتی رہتی ہے۔ تسلسل زندگی کو ہے نہ فنا کو یہ نکتہ قیامت اور زمان ومکان کے ارضی وسماوی تقسیم نے بھلا دیا۔ صوفی شعرا بھی اس انحطاط کے شکار ہوئے۔ چنانچہ میر اور غالب دونوں کے یہاں یہ طریق کار الٹا ہوا نظر آتا ہے۔ دونوں ہی بقا کے راز کو فراموش کر کے فنا کو مقدم کر دیتے ہیں ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا (غالب)

پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل فنا، آب رواں سے ہم ہوئے نابود ہر جگہ (میر)

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک، میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں ؍؍

مرنا ہے، خاک ہونا، ہو خاک اڑتے پھرنا اس راہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں ؍؍

بہر حال اس تحریف وتخریب کا جو کچھ سبب ہو اس قسم کے انحطاطی فلسفے سے حافظ کے زمانے سے الی الحال ہر ایک صوفی شاعر متاثر ہوا ہے۔ اس قسم کے خیالات کی جتنی مخالفت کی جائے کم ہے۔ لیکن جب ایک مخصوص خیال کو پردہ بنا کر صوفی شعرا ر کی اچھی باتوں کی بھی مخالفت کی جاتی ہے تو پھر یا تو جہل کی موافقت مدنظر ہوتی ہے یا اپنے ذہنی رجحان کا تحفظ، مثال کے طور پر حافظ کا ایک شعر لیجیے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اس شعر کے بارے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی رائے دے کہ جب حافظ نے یہ شعر کہا تھا تو ترقی پسند تھا لیکن اب رجعت پسند ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسے

یا تو کلاسکی ادب کے جانچنے کی سائنس نہیں معلوم ہے یا پھر وہ لوگوں کو کلاسکی ادب سے متنفر کرنا چاہتا ہے۔ غلامی سے لے کر سرمایہ دارانہ نظام تک طبقاتی شعور کے مختلف منازل رہے ہیں۔ اگر آج کے دور کی طبقاتی جنگ میں جس کا شعور بہت ہی صاف، تیز اور تند ہے ہم غلامی کے عہد یا جاگیردارانہ نظام کے ادب کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو وہ یقیناً ہمیں حقیر معلوم ہوں گے۔ ایسی صورت میں ان کی معنوی افادیت کو ابھار کر ان کے جمالیاتی حظ کو دبانا خود اپنے ساتھ ظلم کرنے کے برابر ہے۔ کارل مارکس نے یونان کے اساطیری ادب اور شکسپیر کو اس نظریئے سے نہیں جانچا ہے اور نہ یہ نظریہ ماضی کے ادب عالیہ کے بارے میں روس ہی میں رائج ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ڈکنس کے ناولوں میں انسان دوستی کا جذبہ طبقاتی جنگ کے تضاد پر غالب آجاتا ہے۔ آپ ڈکنس کو طبقاتی سمجھوتہ باز کہہ سکتے ہیں لیکن اس سے ڈکنس کی عظمت گھٹتی نہیں ہے حالانکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کا ناول نگار تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ بورژوا انسان دوست کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی دوستی مظلوم طبقے کے ساتھ بہت ہی واضح ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ڈکنس کے ناولوں میں جمالیاتی حظ نہیں ہے تو انسان دوستی کے جذبہ کے ماتحت سہی ڈکنس روس میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ اب آپ ایک سیڑھی اور اُتریئے، شکسپیر کا کوئی ڈرامہ ایسا نہیں ہے جس میں اس نے اپنے ہیرو کو مقدر کے ساتھ ہمنوا نہ کیا ہو۔ بہ الفاظ دیگر اس کا کوئی بھی ہیرو تقدیر کی تخلیق میں غالب نظر نہیں آتا ہے شکسپیر کے ہیرو سوویٹ روس کے ہیرو کے شعور کو بیدار نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر بھی شکسپیر روس میں پڑھا جاتا ہے اور ڈکنس کے مقابلے میں زیادہ جمالیاتی حظ کے ساتھ اب آپ اس سے بھی اور ایک سیڑھی نیچے اُتریئے، یونان کا کلاسکی ادب جس کا

کائناتی نقطۂ نگاہ بالکل ہی طفلانہ ہے۔ آج کی دنیا میں کیا افادیت رکھتا ہے۔ لیکن کارل مارکس ہر سال پڑھتا تھا اور اسے انسانیت کے زمانہ طفلی کے حافظے کے نام سے یاد کرتا تھا اسی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے یہ کلاسکی جملہ بھی لکھا ہے۔

"یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ یونان کے فنون وادب اور اس کے ادوار مخصوص قسم کی سماجی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہاں یہ سمجھنے میں یقیناً دقت ہوتی ہے کہ وہ آج بھی کیوں جمالیاتی حظ کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اور بعض معنوں میں ایک ایسا معیار قائم کئے ہوئے ہیں جس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔"

یونان کے کلاسکی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے اپنے خیالات کا اظہار کئی جگہوں پر کیا ہے ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ ماضی کے ادب عالیہ کے بارے میں کارل مارکس کا نقطۂ نظر تاریخی تھا۔ چونکہ اس کی حقیقت بیں نگاہیں ایک دور کو دوسرے دور کے ساتھ گڈ مڈ نہیں کرتی تھیں اور چونکہ وہ سماجی شعور کے مختلف منازل سے بھی واقف تھا اس لئے وہ جمالیاتی حظ حاصل کرنے سے پرہیز بھی نہیں کرتا تھا۔ آخر ادب کا بھی تو ایک حسن ہے، جسے مارکس نے ابدی حسن کہہ کر یاد کیا ہے یہ ابدی حسن بقول حافظ ہر شخص حاصل نہیں کر پاتا ہے

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند؛ نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

اگر مارکس کا نظریہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حافظ کا شعر نہ صرف ماضی ہی میں ترقی پسند تھا بلکہ آج کی تاریخ میں بھی حسین ہے۔ کیونکہ وہ جمالیاتی حظ کا سبب بنا ہوا ہے۔ اور جب ہم حافظ کے اس شعر کو مثال کے طور پر پیش کریں تو ہمیں یہ نہ کہنا چاہئے کہ دیکھو ایسا کہو گے تو رجعت پسند ہو گا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر یوں کہو گے تو حسین ہو گا۔ لیکن

یہ بات انھیں کے لئے صحیح ہے جو ماضی میں ترقی پسند روایات کے حامل رہے ہیں اور جنھوں نے پرانے کے خلاف جنگ کی ہے۔ کیونکہ حسن ترقی کے ساتھ آمیز ہے۔

اب میں حافظ کا ایک دوسرا شعر پیش کر رہا ہوں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

یہ واقعی بڑا رجعت پسندانہ خیال ہے کہ جو معما حکمت سے نہ کھل سکے بھلا اسے مطرب کیوں کر کھول سکتا ہے۔ غالباً یہی فلسفہ خیام کا بھی تھا۔ پھر بھی خیام نے ایرانی ادب میں مادی اور حسی فلسفے کو جنم دیا۔ لیکن میں خیام کا سہارا ہی کیوں لوں۔

حافظ کے اس رجعت پسندانہ فلسفے کے بارے میں میرا جو آج ردعمل ہے وہ سائنس اور مادی علوم کی بڑھتی ہوئی روشنی کے باعث ہے، جب کہ روز بروز معمے پر معمے کھلتے جا رہے ہیں۔ کیا یہی بات حافظ کے وقت کے لئے بھی صحیح تھی۔ اگر آپ حافظ کے وقت کا جائزہ لیں اور یہ بات تیرھویں صدی عیسوی کی ہے جبکہ یورپ میں بھی اندھیرا تھا۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حافظ کے زمانے میں مادی علوم کی تعلیم ہی نہ ہوتی تھی۔ مدرسوں میں معقولات اور منقولات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ معقولات کا دائرہ فلسفہ الٰہیات تھا اور منقولات کا دائرہ احادیث۔ فلسفۂ الٰہیات سے مادی علوم کو بالکل خارج کر دیا گیا تھا۔ مادی علوم کے خلاف یہ جنگ تین سو سال پہلے سے لڑی جا رہی تھی۔ اس کی ابتدا معتصم باللہ کے زمانے سے ہوتی ہے، جب کہ مادئین (لطف یہ ہے کہ اس وقت وحدت الوجودیوں کو بھی مادئین میں شمار کیا جاتا تھا) کو تہ تیغ کر دیا گیا اور تمام مادی علوم کی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی۔ اس وقت سے ایران مادی علوم سے دور ہوتا گیا۔ حافظ کے وقت میں تو

خالصتاً فقہی تعلیم رہ گئی تھی۔ ایسے ماحول میں اگر حافظ نے فقہی حکمت کی مخالفت کی تو کیا قصور کیا۔
یہاں حیب حافظ حکمت کے خلاف ردِّ عمل کرکے مطرب و مے کی طرف بڑھتا ہے
تو اس کا اشارہ صرف محسوسات کی طرف ہے اور محسوسات علوم کے اولین نیتے ہیں۔
انھیں معنوں میں خیام اور حافظ نے حسی فلسفے کو ایرانی ادب میں داخل کیا ہے۔ یہ ایرانی
بیگنزم کی بازگشت تھی جو بالکل ایک مادّی فلسفہ تھا ع

گرمی گوید کہ ہست عالم نیست رب (رومی)

مادیت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے پہلے اپنے حواس کی قوتوں کو بروئے کار
لانا پڑتا ہے۔ مادی علوم الہیاتی منطق کی کوکھ سے نہیں پیدا ہوتا ہے۔ یونان کا مادی
فلسفہ یونان کی پیگنزم سے پیدا ہوا۔ یورپ میں بھی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے زمانے میں
مفکر طبقے اور ادیبوں نے پیگنزم سے بے تکان عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ مادی زندگی کی مسرتوں
کو اپنائے بغیر مادیت کا نظریہ مستحکم بھی نہیں ہوتا ہے۔

حافظ کے سامنے مادی علوم نہ تھے۔ وہ خود امام غزالیؒ کے ہاتھوں بیعت کر چکے
تھے۔ پھر بھی ان کی شاعری میں ایرانی بیگنزم حسیہ حقیقت نگاری کے روپ میں ابھر آیا ہے۔ مادی
حقیقت نگاری حسیہ حقیقت نگاری کے بغیر وجود میں نہیں آتی ہے۔ حافظ کا یہ بہت بڑا
کارنامہ ہے کہ اس نے الہیاتی منطق کے خشک طریق استدلال کے خلاف بغاوت
کرکے حسیہ اظہار حقیقت سے ایرانی ادب کو مالا مال کر دیا۔ کیا یہ شعر رجعت پسندانہ ہے؟

اس موقع پر میرے سامنے علامہ اقبالؒ کے وہ اشعار بھی ہیں جو انھوں نے کبھی
حافظؒ کے بارے میں کہے تھے۔ مجھے موصوف کی اس تنقید سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ
جہاں تک حافظ فلاطونی گوسفند ہونے کا تعلق ہے ہر وہ شخص فلاطونی گوسفند ہے جو مادّے کو

مخلوق سمجھتا ہے۔ پھر یہ کون سمجھائے کہ حافظ "صہبا گسار" اور مولانا رومی میں کیا فرق ہے کیوں ایک سے خطرے کا اظہار کیا جاتا ہے اور دوسرے کو امام بنایا جاتا ہے۔ کیا اس خیال سے کہ حافظ زیادہ ایرانی اور رنگین ہے۔ تیسری بات اور بھی پیچیدہ نظر آتی ہے۔ علامہ اقبالؒ عرفی کی تتبع کے لئے ہدایت کرتے ہیں اور عرفی حافظ کی شاعری پر ایمان رکھتا ہے[۹]

گر خداوندی ہوس داری در اقلیم سخن بندگیٔ حافظ شیرازمی بایست کرد (عرفی)

اِن تمام باتوں میں علامہ اقبال نے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے وہ ہے حافظ کی جادو بیانی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں اس کا حاصل کرنا مشکل ہے اس کی نعمت خطرناک بھی ہے وہ آنے والی نسلوں کو سہل انگاری سے روکتی ہے انھیں بار بار یاد دلاتی رہی ہے کہ خیالات کو منظم کر دینا ہی شاعری نہیں ہے۔ شعر ایک تخلیقی پیکر ہے جو صورت و معنی کے جدلیاتی طریق کار سے ابھرتا ہے۔

پھر کیا عجب کہ کچھ لوگ حافظ سے اس بری طرح متعصب ہو جائیں کہ اگر غزل کے انحطاط پر بات کرنی ہو تو وہ حافظ کا تذکرہ کریں ۔[۹]

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

اب دیکھنا ہے کہ ان غلطیوں کا اصلی سبب کیا ہے جو ذاتی اغراض و مقاصد سے آزاد ہے۔ پہلی غلطی تو مختلف ممالک کے سماجی ارتقا کے سمجھنے میں ہوتی ہے۔ مغرب کا تاریخی ارتقا اور وہاں کا طبقاتی شعور ایشیا کے تاریخی ارتقا اور سماجی شعور سے آگے رہا ہم مغربی تاریخ کے شواہد کو میکانکی طور پر مشرق پر لاگو نہیں کر سکتے اور نہ ہم تاریخ کے مختلف ادوار کو اس طرح خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ گویا ایک تعلق دوسرے دور سے تھا ہی نہیں۔ اکثر اوقات ہم میکانکی طور پر غلام تہذیب کی پیٹھ پر جاگیر دارانہ نظام اور اس کی پیٹھ پر

سرمایہ دارانہ نظام کی اینٹ چھنتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور ان تینوں دور کو ایک معنی ہیں ایک عہد (epoch) سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ذرائع پیداوار اور تہذیب کے مادّی وسائل کے بڑھنے کا تعلق ہے ایک دور کو دوسرے دور پر برتری حاصل ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ غلام کے مقابلے میں کھیت مزدور اور کھیت مزدور کے مقابلے میں مل مزدور کی آزادی نسبتاً آگے بڑھتی رہی ہے۔ لیکن ذرائع پیداوار پر ایک مخصوص طبقے کے تصرف حاصل کر لینے سے غلامی کا دور ختم نہیں ہو جاتا ہے تا وقتیکہ وہ طبقہ استحصال کی بنیادوں کو ختم نہ کر دے۔ یہی سبب ہے کہ مارکس نے ان ادوار کو ایک عہد (epoch) کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ پورا عہد غلامی کا عہد ہے اس میں استحصال کی شکلیں تو ضرور بدلتی رہی ہیں لیکن استحصال ختم نہیں ہوا ہے۔ انھیں معنوں میں اشتراکی انقلاب اپنے ماسبق کے انقلاب سے بہت ہی مختلف ہے۔ یہ فرق ایک بنیادی تبدیلی کا ہے۔ اشتراکی انقلاب کی یہ بنیادی خصوصیت اس طبقاتی شعور کا نتیجہ ہے جسے بورژوا نظام نے بہت ہی تیز کر دیا ہے۔ آج بورژوا نظام کے طبقاتی شعور میں جو تیزی اور تندی ہے اگر اس کی بنیاد پر آپ جاگیردارانہ نظام کے طبقاتی شعور کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی ناکامی ہوگی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جاگیردارانہ نظام میں طبقاتی جنگ یا طبقاتی شعور نہ تھا۔ اس سے صرف اتنا مراد ہے کہ اس وقت طبقاتی شعور اتنا بڑھا ہوا نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ کیونکہ اس وقت لوٹنے والے اور لوٹے جانے والے طبقوں کا تضاد اتنا ابھر نہیں پایا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کے بہت سے دبے ہوئے تضاد کو سرمایہ دارانہ نظام نے ابھارا ہے اور بہت سے اس نظام کے دبے ہوئے تضاد کو اشتراکی نظام نے ابھارا ہے۔ میں وضاحت کے لیے ہندوستان

کی تاریخ سے ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے دیہات کی زمینوں پر کسانوں کا قبضہ تھا۔ بظاہر ذرائع پیداوار پر تصرف انفرادی تھا۔ لیکن وہ اپنی محنت سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا پاتے تھے کیونکہ پیداوار کا ایک تہائی یا چوتھائی حصہ وہ جاگیردار کو بھی دیتے تھے۔ یہاں چونکہ ذرائع پیداوار پر براہِ راست تصرف جاگیردار کا نہ تھا اس لئے جاگیرداروں اور کسانوں کا طبقاتی تصادم بھی اتنا شدید نہ تھا جتنا کہ انگریزی راج میں ہوا۔ انگریزوں کے آنے سے یہاں کے طبقاتی تعلقات میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے دیہات کی جماعتی زندگی کو تباہ کرکے زمینیں محصول جمع کرنے والے طبقے یعنے زمینداروں کو دیدی۔ اب زمینی ذرائع پیداوار پر براہِ راست تصرف زمینداروں کا ہے۔ کیونکہ وہ انھیں بے دخل بھی کرسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کی لڑائی آگے بڑھی ہوئی ہے اور ان کا طبقاتی شعور بہت بیدار ہے۔ آج کی ایسی شعوری آگہی جاگیردارانہ نظام میں نہ تھی۔ لیکن طبقاتی کشمکش تو تھی ہی یہ بات صحیح ہے۔ لیکن اس کشمکش کا اظہار شاہی سیاست میں بھی ہوتا ہے اینگلز لکھتا ہے کہ "تمام انقلابی عناصر جو جاگیردارانہ نظام کی تہوں میں اٹھتے تھے وہ سب کے سب شاہی طاقت کی طرف راجع ہوتے تھے اور آخرالذکر ان کی طرف راجع ہوتا تھا۔" ایسی صورت میں جب ہم جاگیردارانہ نظام کی سیاست اور طبقاتی شعور کا پتہ چلانے کی کوشش کریں تو ہمیں بادشاہوں کی سیاست کو نظرانداز نہ کردینا چاہئے۔ یہ راستہ کافی مشکل ہے۔ یہاں سر کھپانے کی ضرورت پڑتی ہے ہمیں جلد بازی میں کسی بھی استحصالی طبقے کے مفکر کی تنقید قبول نہ کرلی چاہئے۔ کیونکہ وہ اپنے مخالف طبقے کی پول کھولنے میں تو بہت ہی کامیاب رہتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت کی تہوں تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ اس کا

استحصالی رجحان حقیقت تک پہنچنے میں ایک پردہ بن جاتا ہے۔ خیر یہ ایک ضمنی بات ہوئی ورنہ ستم ظریفی تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ میر اور غالب کی شاعری میں کسانوں کی بغاوت اور پلاسی کی جنگ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے تو انھیں رجعت پرست کہہ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ میکانکی تصور ہمیں دوسری قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہم اشتراکی اور فیوڈل نظام کو دو پلّوں میں رکھ کر موازنہ کرنے لگتے ہیں اور جب فیوڈل کا پلّہ ہلکا نظر آتا ہے تو پھر ماضی کی حسین روایات پر بھی حقارت کی نظر ڈالنے لگتے ہیں۔

ماضی کی حسین روایات کو حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اصل میں تاریخ کو مٹانے کا جذبہ ہے اور تاریخ کو وہی مٹاتا ہے جس میں کچھ احساس کمتری ہوتا ہے۔ وہ تمام ادیب اور شعراء جو اپنے فن کو اس حد تک چمکا نہ سکے ہیں کہ اپنے کلام میں بھی ایک ابدی حسن پیدا کر سکیں۔ ماضی کی حسین روایات کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ادبی حسن کا واہمہ ہی ختم ہو جائے۔ پھر تو ناظم کے لئے میدان خالی رہ جاتا ہے۔

یہ ابدی حسن صرف یونان کے کلاسکی ادب ہی کے بارے میں صحیح نہیں ہے بلکہ ہر دور کی بہترین ادبی تخلیقات کے بارے میں صحیح ہے۔ ہر دور کے ادب کا نہ صرف مواد ہی بدلا ہوا ہے بلکہ ہیئت بھی بدلی ہوئی ہے۔ پھر بھی ان کے باہمی امتزاج سے جو حسن پیدا ہوا ہے وہ سب کو نصیب نہیں ہوا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑے گا اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہمیں ادب کے مقتضیات کا پتہ چلانا ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ ادب مخصوص قدروں اور خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تبلیغ کا اثر وقتی ہے یا دیرپا، وہ ہمارے جذبات اور خیالات کو متحرک کر کے ایک دیرپا

عمل کی تحریک کرتا ہے یا صرف وقتی جوش میں لا کر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ہمارے احساسات اور نفسیات کی جوابی صلاحیتوں کو چھوتا ہے کہ نہیں۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ نہیں کہ وہ ہماری نفسیات پہ اثر انداز ہو کر ہمیں حالات کے بدلنے اور خود اپنے کو بدلنے میں مدد کر سکے اور ہماری نفسیات کو نئی قدروں سے ہمنوا کرکے ایک نئی جذباتی تنظیم بھی کر سکے۔ اگر یہ قوت اور صلابت کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ قصور ماضی کی حسین روایات کا نہیں ہے، یہ اس کا اپنا عجز ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو ایسے زندہ اور متحرک سانچوں میں ڈھال سکے جن کی بازآوری سے ہمارے اندر حیاتِ نو پیدا ہو جائے۔ مشاہدے اور تجربے کی بند کمانیاں کھلنے لگیں اور قدم قدم پر صداقت کی داد دیتی جائیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم عوام کو نئے خیال اور نئے معرکے کی طرف اکسا سکتے ہیں۔ یہ اکساہٹ اسی وقت دیرپا ہو سکتی ہے جبکہ وہ شاعری کے مشاہدے اور خیال کی سچائی کو اپنے ذاتی تجربے کی سطح پر محسوس نہ کریں اور انھیں لفظوں تشبیہوں اور تصویروں کے ذریعے محسوس نہ کریں جن سے ان کے حواس آشنا ہیں۔ یہاں ہمیں عوامی ادب اور ماضی کی روایات سے بہت سی چیزیں مستعار لینی پڑیں گی۔ یہ کام کھینچنے اور چنگھاڑنے سے زیادہ نپنے اور تپانے کا ہے۔ تقریر کا کام وقتی ہوتا ہے لیکن ادبی شہ پارے کا اثر دیرپا ہوتا ہے .... وہ انسانی ذہن میں رینگتے رہتے ہیں ہمیں بار بار اکساتے اور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ترغیب عمل میں ایک ایسی پائداری ہوتی ہے جو کوہِ گراں کا مقابلہ بھی کر سکتی ہے اور ایسا ہی ادب پھانسی پہ جھولنے کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ یہ مرتبہ تقریر کو حاصل نہیں ہوا کرتا ہے۔ شعر و ادب کی تخلیق، تصورات کی بارآوری نہیں بلکہ از سرِ نو تخلیق کرنے کا کام ہے۔ اس پورے طریق کے

مادی اسباب ہیں جنھیں تفصیلات میں سمجھا بھی جا سکتا ہے، انھیں معنوں میں یہ معجزہ بھی نہیں ہے۔
اس طریق کار کے سمجھنے میں مشاہیر علم و ادب کے کلام کا مطالعہ بہت مدد کرتا ہے۔ گورکی کا
ادب فلابیر کے ادب سے بنیادی طور پر مختلف ہے تاہم اس نے فلابیر سے لکھنا سیکھا
چیخوف کا فن کسی حد تک حزن و یاس اور افسردگی کا حامل ہے پھر بھی گورکی کو یہ کہنا پڑا
کہ میں جب تمھارے فن سے اپنے فن کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں
قلم سے نہیں بلکہ بانس سے لکھ رہا ہوں۔

یہ ایسی مثالیں ہیں جو شعر و ادب کی تخلیق میں سنگ میل بن سکتی ہیں اور اگر انسان
محنت کرتا ہے تو وہ اپنے فن کو مانجھ بھی سکتا ہے۔ پھر بھی وہ صرف اسی راستے سے صحیح
ادبی تخلیق تک نہیں پہنچ سکتا ہے اسے عوام کی زندگی سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور جب وہ
یہ کام زندگی کے کسی انقلابی موڑ پر انجام دیتا ہے تو اسے ماضی کی روایات کو جگانا بھی پڑتا ہے
وہ ماضی سے نعرے، نام اور ملبوس سب قرض لیتا ہے تاکہ وہ نئی حقیقت کو عوام کے
محبوب ملبوس ہی میں پیش کر سکے۔ آج کا انقلابی شاعر جس حد تک اس حقیقت سے دور رہتا جائےگا
عوام سے بھی دور ہوتا جائے گا۔

اچھا شعر کہنا خونِ جگر اگلنے کے برابر ہے۔ اپنی ناکامی پر اور زیادہ محنت کرنی چاہیے
نہ کہ لوگوں کو حسن کے معیار ہی سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

منظومات

احمد ریاض
احمد ندیم قاسمی
اختر الایمان
اسرار الحق مجاز
افضل پرویز
بلراج کومل
تاجور سامری
تخت سنگھ
جاں نثار اختر
جمیل ملک
جوش ملیح آبادی
حامد عزیز مدنی
حسن اعرافی
خاطر غزنوی
خلیل الرحمان اعظمی
ساحر لدھیانوی
سردار جعفری
شاد عارفی
ظہیر کاشمیری
عبد الحمید عدم
غلام ربانی تاباں
فراق گورکھپوری
فکر تونسوی
فیض احمد فیض
قتیل شفائی
کمال احمد صدیقی
کیفی اعظمی
گوپال متل
مجروح سلطانپوری
مجید امجد
مخمور جالندھری
مسعود حسین
معین احسن جذبی
ملک حمید
منیب الرحمان
میراجی
ن۔م۔ راشد

احمد ریاض

دُوسری دیوارِ چین!

ہزاروں تیشوں کے عزمِ پیہم نے اس کو رنگِ شباب سونپا
ہزاروں انتھک جوان ہاتھوں نے اس کو ڈھالا اسے سنوارا
ہزاروں بکھرے ہوئے خیالوں نے اس کو نقشِ دوام بخشا
ہزاروں تپتے ہوئے ارادوں نے اس کے ہر نقش کو اُبھارا

تحفظِ ملک و قوم کے واسطے اُچھالا گیا تھا جن کو
انھیں مشقت کے دیوتاؤں کا خوں ڈبویا گیا ہے اس میں
انھیں جواں سال کامگاروں کی رُوح آواز دے رہی ہے
ہماری محنت ہمارے اخلاص کو سمویا گیا ہے اس میں

ہمارے ہاتھوں کا وہ عرق جس عرق سے محلوں کا حُسن بھڑکا
وہی عرق اس کے ذرّے ذرّے میں بس رہا ہے مہک رہا ہے
ہمارے جسموں کا سوز اس کی حیاتِ جاوید کا ہے ضامن
ہمارے احساس کی حرارت سے اس کا دامن بھڑک رہا ہے

ہماری اُس جہدِ زیست پرور کو زندگی یوں اُبھارتی ہے

عروسِ تاریخ اس کو دیوارِ چین کہہ کر پکارتی ہے

ہزاروں جسموں کا خون، ڈھانچوں کی کھاد، بنیادمیں ہے اس کی

ہزاروں ماؤں کا پیار، بہنوں کا حُسن اس میں مچل رہا ہے

ہزاروں بے خانماں شہیدوں کے عزم کی یادگار ہے یہ

ہزاروں بچّوں کے قہقہوں کا خلوص اس میں پگھل رہا ہے

کسی گلستاں فروش مالی نے زینتِ گلستاں کے بدلے

ہزاروں کلیوں کی لاج کھودی، ہزاروں غنچوں کا مان توڑا

کسی ریاکار ناخدا نے بھنور سے کچھ ساز باز کرکے

فسردہ انسانیت کی کشتی کو عین طوفاں میں لاکے چھوڑا

تحفّظِ دین و شانِ ملّت کا واسطہ دے کے وقت نے پھر

انھیں مشقّت کے دیوتاؤں سے خونِ ارزاں کی بھیک مانگی

پھر اپنے پندارِ خسروی، جاہِ قیصری کے لئے کسی نے

انھیں جواں سال کامگاروں سے عزمِ جولاں کی بھیک مانگی

اور اس طرح ایک اور "دیوارِ چین" تاریخ بن گئی ہے

اور اس طرح پھر ذلیل نفرت "حیات کی رہ میں تن گئی ہے

شاہراہ
خاص نمبر

احمد ندیم قاسمی

وقت

سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
چاند بلّور کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح اٹکا ہے

دامنِ کوہ کی اک بستی میں
ٹمٹماتے ہیں مزاروں پہ چراغ

آسماں سرمئی فرغل میں ستارے ٹانکے
سمٹا جاتا ہے ـــــ جھکا آتا ہے

وقت بیدار نظر آتا ہے!

سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں

صبح کی نقرئی تنویر رچی جاتی ہے
دامنِ کوہ میں بکھرے ہوئے کھیت
لہلہاتے ہیں تو دھرتی کے تنفس کی صدا آتی ہے

آسماں کتنی بلندی پہ ہے اور کتنا عظیم
نئے سورج کی شعاعوں کا مصفّا آنگن

وقت بیدار نظر آتا ہے!

سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
آفتاب ایک الاؤ کی طرح روشن ہے

دامنِ کوہ میں چلتے ہوئے ہل
سینۂ دہر پہ انسان کے جبروت کی تاریخ رقم کرتے ہیں

آسماں تیز شعاعوں سے ہے اس درجہ گداز
جیسے چھونے سے پگھل جائے گا

وقت تیار نظر آتا ہے!
سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
زندگی کتنے حقایق کو جنم دیتی ہے
دامنِ کوہ میں پھیلے ہوئے میدانوں پر
ذوقِ تخلیق نے اعجاز دکھائے ہیں — لہو اُگلا ہے

آسماں گردشِ ایّام کے ریلے سے ہراساں تو نہیں
خیر مقدم کے بھی انداز ہوا کرتے ہیں

وقت کی راہ پہ موڑ آتے ہیں، منزل تو نہیں آسکتی

جنگ

میں نے دیکھا ہے ٹپکتے رگِ آہن سے لہو
سنگ پاروں سے ابلتی ہوئی دیکھی ہے شراب
میں نے دیکھا ہے سرِ شاخ پہ ہنگامِ بہار
آتشِ گل سے جھلستے ہوئے خود برگِ گلاب
میں بھی اس بھیڑ میں تھا جو سرِ مقتل آئی
پا بدستے دگرے دست بدستے دگرے

مرگِ انبوہ میں بھی جشن کا سامان نہ تھا
کوئی ایسا نہ تھا جو جامِ مئے تند بھرے
سر بہ زانو تھا کوئی خاک بسر تھا کوئی
محفلِ زیست میں بجھتا سا شرر تھا کوئی

وسطِ مشرق کی یہ خندق تھی مقدر جن کا
ان میں سے ایک نے اک روز کہا تھا مجھ سے
میں نے باندھا تھا کسی شوخ سے پیمانِ وفا
اُن گھنی پلکوں میں وہ پیار سے بھرپور آنکھیں
ڈبڈبا آئیں، چھلک اٹھیں ستارے ٹوٹے
میں جو رخصت ہوا چلتے ہوئے رخسار پہ
چھا گیا شام کا رنگ اور سہارے ٹوٹے
اُس کے ہونٹوں پہ کوئی بات تھی میں سن نہ سکا
میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کہیں روک نہ لے
کیا خبر کہتی ہو اک موت کا جھونکا آیا
ایک گولی نے کیا ختم کہ افسانہ سنے
کون اس سوختہ جاں سوختہ تن کا، چھوڑو
بھاگ کر چھپ گئے ہم اپنی پناہ گاہوں میں
کھینچ کر ڈال دیا اس کو اسی خندق میں
دفن تھے جس میں کئی ایسے فسانے کب سے
دفن ہوتے ہی چلے آئے تھے جانے کب سے!

میں نے سوچا، کبھی مل جائیے، کہوں گا اُس سے
حاکمِ وقت کا منشا تھا ——— محبت کی جگہ
اُس کو نفرت ملے، نفرت ہے ابھی لطفِ خرام
جس جگہ جاؤ وہاں مشرق میں بھی مغرب میں بھی
وسطِ مشرق کی زمیں نے تجھے بھیجا ہے سلام

اسرار الحق مجاز

آج

کار فرما پھر مرا ذوقِ غزل خوانی ہے آج
ہر نفس کا ساز گرمِ شعلہ افشانی ہے آج

پھر نگاہِ شوق کی گرمی ہے اور روئے نگار
پھر عرق آلود اک کافر کی پیشانی ہے آج

پھر ادھر لب پہ قصیدے ہیں لب و رخسار کے
پھر ادھر چہرے پہ تابانی سی تابانی ہے آج

حُسن اس درجہ نشاطِ حُسن میں ڈوبا ہوا
انکھڑیاں بے خودِ شمیمِ زلف دیوانی ہے آج

لرزشِ لب میں شراب و شعر کا طوفان ہے
جنبشِ مژگاں میں افسونِ غزلخوانی ہے آج

وہ نفس کی زمزمہ سنجی نظر کی گفتگو
سینۂ معصوم میں اک طرفہ طغیانی ہے آج

یاں بایں عالمِ غرورِ یوسفیت بھی نہیں
واں زلیخائی بہ عزمِ چاک دامانی ہے آج

واں اشارے میں بہک جانا ہی عینِ ہوش ہے
ہوش میں رہنا یقیناً سخت نادانی ہے آج

وہ لبوں کی انگبیں پینے کی سرکش آرزو
کس قدر آزاد اُن زلفوں کا زندانی ہے آج

کشمکش سی کشمکش ہے ہر مذاقِ عاشقی
کامراں سی کامراں ہر سعیِ امکانی ہے آج

حُسن کے چہرے پہ ہے نورِ صداقت کی دمک
عشق کے سر پہ کلاہِ فخرِ انسانی ہے آج

شوق سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
میں نے اُن کی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

افضل پرویز

حکمراں کی ساحری

ہمارے ماموں کے باغ میں شہ پسند کے پیڑ جھولتے ہیں
ہم ان کے بھانجے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بہن کے چہیتے بیٹے
وہ کتنے ہمدرد ہیں ہمارے
انھوں نے اسکول کی مصیبت سے بیوہ ماں کے جگر کے ٹکڑے
کو کتنی جلدی چھڑا لیا ہے
اور اپنے آموں کے باغ کی خاص خاص خدمات سونپ دی ہیں
مزے سے آموں کی چھاؤں میں گو پھیلائے اونگھتے ہیں دن بھر
ادھر حمید و نسیم و نجمہ (ہمارے ماموں کے شوخ بچے) پھنسے ہیں
کالج کی الجھنوں میں
ہماری بیگم بھی ہیں مزے میں
امورِ خانہ سبھی انھیں کے سپرد ہیں

اور ہمارے ماموں اور اُن کی بیگم اور اُن کے بچّوں کے اُجلے
کپڑے، چمکتے برتن، دمکتے سیٹ ہیں ہماری بیگم کے دم قدم سے
بڑی ہی بھولی، بہت ہی کم گو، بڑی سلیقہ شعار ہیں وہ
ہمیں نہیں غم، نہیں ہوئی پوری نانا مرحوم کی وصیت
وہ شوخ نجمہ اک آنکھ بھائی نہیں ہمیں تو
بلا سے، اس بھونڈے اور توندیل خاں صاحب سے بیاہ دی جائے
ہماری بیگم ہمیں مبارک
مگر وہ عفریت، اس کا ہمزاد۔ اس کے تحت الشعور کا دیو جس پہ
خواب گراں ہے طاری
کبھی کبھی بڑبڑانے لگتا ہے نیند ہی میں
"مجھے کسی پیڑ کے تنے سے کوئی دفینہ ہی ہاتھ آجائے
ہزاروں لاکھوں کی میرے حق میں کبھی کوئی لاٹری نکل آئے۔
تو اپنے ماموں کے باغ سے دس گنا بڑا ایک باغ لے لوں
فٹن تو کیا ایک کار لے لوں
میں سوٹ پہنوں، شراب انڈیلوں

تو میرا ماموں خوشی سے نجمہ کو میرے پہلو میں لا بٹھائے"
مگر یہ آواز ڈوب جاتی ہے خواب کے بحرِ بیکراں میں
اور اس کے ماموں کے سبز باغ، اس کے سامنے لہلہانے لگتے
ہیں، ناچتے ہیں
یہ پا بریدہ یہ پر شکستہ ارادے، ان کی بساط ہی کیا، اڑان
ہی کیا

مگر وہ عفریت اس کا ہمزاد اس کے تحت الشعور کا دیو
کسی دھماکے سے یک بیک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، چونک اُٹھے
تو جانے کیا ہو؟!

جاوید
نمبر ۳

برّاج کومل

جنگ

تیرگی میں بھیانک صدائیں اٹھیں
اور دھواں سا فضاؤں میں لہرا گیا
موت کی سی سپیدی افق تا افق
تلملانے لگی،

اور پھر ایک دم
سسکیاں چار سو تھرتھرا کر اٹھیں
ایک ماں سینہ کوبی سے تھک کر گری
ایک بہن اپنی آنکھوں میں آنسو لئے
راہ تکتی رہی،
ایک ننھا کھلونے کی اُمید میں
سر کو دہلیز پہ رکھ کے سوتا رہا،

ایک معصوم صورت دریچے سے سر کو لگائے ہوئے
خواب بُنتی رہی،
منتظر تھیں نگاہیں بڑی دیر سے،
منتظر ہی رہیں ......،
موت کی سی سپیدی افق تا افق
تلملاتی رہی!

تاجور سامری

غزل

پھر کیوں میرے دھندلے درپن میں جھلکے
تم تو چھلیا ہو چھپ جاؤ گے چھل کے

آج میں تیرے پیار کے ناز اُٹھاؤں کیا
گھاؤ ابھی تازہ ہیں کلیجے پر کل کے

میرا رونا اور تڑپنا دیکھے کون!
تم تو سپنے دیکھتے ہو امبر تل کے

من کے اصلی چھور کا ملنا مشکل ہے
بے معلوم کنارے ہیں اس جنگل کے

آخر کوئی بھور بھی ہے اس جیون کی
رات تو رات! یہاں دن بھی ہیں کاجل کے

من اک چھالا تھا آخر کو پھوٹ گیا
اب تیری سیپوں سے موتی کیوں ڈھلکے

مجھ کو یہ اندھیارا نگلے جاتا ہے
کہاں ہو چندا! میرے تارا منڈل کے

تخت سنگھ

لال سویرا

وہ دیکھو! گلرنگ اُفق سے
جھانکا لال سویرا
چھوٹ چلی ہیں رات کی نبضیں
کانپا گھور اندھیرا
من من میں ہے جیون بھر کے
سکھ سپنوں کا ڈیرا
لہرائیگا پل دو پل میں
ہر جا سُرخ پھریرا
وہ دیکھو! گلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

(۲)

ایکا ایکی پھوٹ پڑیں گے
نُور کے سیمیں دھارے
شعلے بن کر ناچ اٹھیں گے
چرخ کے ٹھنڈے تارے
ہو جائینگے راکھ جُھلس کر
صدیوں کے اندھیارے
اُٹھنے کو ہے جیون تجھ سے
دُکھ کا ٹانڈا ڈیرا
وہ دیکھو! گلرنگ اُفق سے
جھانکا لال سویرا

(۳)

وہ کانٹوں کی شمشیروں کو
دیکھ کے گُل غرّائے

وہ ناچ اُٹھے خاک کے ذرّے
وہ غنچے مُسکائے
وہ بھاگے کرنوں کے آگے
ڈھلتی رات کے سائے
وہ آزادی کے سُورج نے
ہر سُو نُور بکھیرا
وہ دیکھو! گلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

(۴)

ایکا ایکی کروٹ لے کر
وہ محنت کش جاگے
وہ سیلاب سا اُمڈا ہر سُو
وہ ظالم اُٹھ بھاگے
کانپ رہے ہیں دھنیوں کے دل
مزدوروں کے آگے
وہ لاکھوں بھوکوں نے مل کر
محلوں کو جا گھیرا
وہ دیکھو! گلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

(۵)

دھرتی پر سب کا حق ہو گا
سُکھ کے دن آئیں گے
محنت کش اپنی محنت کا
خود ہی پھل کھائیں گے
آزادی کے مدھر ترانے
سب مل کر گائیں گے
راہگیروں کو چھُو نہ سکے گا
کوئی چور لٹیرا
وہ دیکھو! گلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

ادب لطیف
سالنامہ

جاں نثار اختر

تابِ سخن

ہند صدیوں کی غلامی سے تو آزاد ہوا
تم بھی آزاد ہوئے اہلِ وطن سے پوچھو

غنچۂ گُل کے چٹکنے کی صدا تو آئی
پھول بھی کوئی کھلا شاخِ چمن سے پوچھو

آج ذرّات کے سینے میں اندھیرا تو نہیں
جگمگاتی ہوئی نوخیز کرن سے پوچھو

اب تو ساحل پہ پیاسا نہیں مرتا کوئی
موجۂ گنگ لبِ رودِ جمن سے پوچھو

اب تو محفل میں نہیں حکم زباں بندی کا
رنگِ خاموشیٔ اربابِ سخن سے پوچھو

آج تو زہر بھرے جام نہ پینا ہونگے
لذّتِ تشنگیٔ کام و دہن سے پوچھو

اب تو جینے کی تمنّا میں نہیں مرنا ہے
دربدر لاشۂ بے گور و کفن سے پوچھو

کل کے وعدے تمہیں شرمندۂ ایفا تو نہیں
سادگیہائے بتِ وعدہ شکن سے پوچھو

اب تو دل پر اثرِ جادوئے افرنگ نہیں
تو طلسمِ نگہِ سحر فگن سے پوچھو

اب تو پیدا نہیں منصورِ بغاوت کوئی
منتظر مرحلۂ دار و رسن سے پوچھو

اب بھی کیا رشک کے قابل نہیں خلدِ کشمیر
گلستانِ ارم و باغِ عدن سے پوچھو

اس زمیں پر بھی کسی روز شفق پھوٹے گی
دوستو! خاکِ شہیدانِ وطن سے پوچھو

افکار
خاص نمبر

جمیل ملک

انتظار

نہ جانے کب بہار آئی اور کب چلی گئی!
مجھے تو کچھ خبر نہیں!
نہ جانے کب بہار آئی اور کب چلی گئی!
مجھے تو اتنا یاد ہے
میں انتظار کر رہا تھا اک نئی بہار کا
خزاں نصیب کہہ رہے تھے "آئیگی بہار — اور پھر کبھی نہ جائیگی"
مگر نہ جانے کیا ہوا —
اک آتشیں غبار سا ہر ایک سمت چھا گیا
فضائیں شعلہ ریز ہو گئیں
دُکھی دلوں کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو گئیں
ہر ایک چیز آ گئی اس آتشیں غبار کی لپیٹ میں

نہ جانے کب بہار آئی اور کب چلی گئی!
مجھے تو کچھ خبر نہیں!
میں منتظر ہوں آج بھی اُسی نئی بہار کا
اُسی کے واسطے میں دوڑ دھوپ کر رہا ہوں اتنی دیر سے
خزاں نصیب مدّتوں سے جس کی راہ تک رہے ہیں دل
میں اک ہجوم آرزو لئے
جو ایک بار آئے گی تو لوٹ کر نہ جائے گی

جوش ملیح آبادی

شاندار دعوے

قرنوں کے شاندار یہ دعوے کہ زندگی
اک مہرِ لایزال سے پاتی ہے روشنی

جوئے علوم و چشمۂ حکمت ہے زندگی
انصاف و عدل و رافت و رحمت ہے زندگی

ہر اک شکم ہے رزق کا وعدہ لئے ہوئے
ہر وعدہ ہے فراغتِ ایفا لئے ہوئے

دنیا نہیں بہشت ہے دار السلام ہے
اک رحمتِ تمام ہے اک فیضِ عام ہے

تقدیر کا غلط ہے کہ ہیٹا ہے آدمی
قدرت شفیق باپ ہے بیٹا ہے آدمی

اک آبشارِ جود ہے اک بحرِ مرحمت
شبنم کی طرح نرم ہے قلبِ ربوبیت

پل بھر بھی چشمِ دہر میں ہوتی ہے جب کھٹک
دل میرِ زندگی کا دھڑکتا ہے دیر تک

بھرتی ہے آہ سرد جو لیلائے زندگی
ہوتا ہے چاک سینۂ دارائے زندگی

انسانیت کا درد ہے قدرت لئے ہوئے
شاعر کا عشق، ماں کی محبّت لیے ہوئے

عشرت کی دھوم دھام ہے ہستی کی ریل پیل
ہستی کا کارخانہ ہے اک مشفقانہ کھیل

پیرِ مغاں کے فیض سے چھلکے ہوئے ہیں جام
ذرّوں کے دل میں نصب ہیں خورشید کے خیام

المختصر تمام یہ دعوے کہ آسماں
روندی ہوئی زمیں پہ ازل سے ہے مہرباں

ایں آئینہ گلے و سکندر چو بلبلے
المختصر تمام یہ دعوے یہ غلغلے

جھٹلا دیا ہے ان کو غمِ کائنات نے
ان سب کے منہ پہ تھوک دیا ہے حیات نے

تحریک
دسمبر

حامد عزیز مدنی

پچھلے پہر کا چاند

بیضوی ماہتاب سوئے افق
ایک یرقاں زدہ مریض کی آنکھ!
رات کا طنز، روشنی کا ہدف
ریگ ساحل سے پُر غلیظ صدف
مبتلائے فریبِ دیدہ وری
صیدِ شورش، اسیرِ خود نگری
محوِ صد شیوہ ہائے بال و پری

ایک بے خواب دھند میں مستور
اک معلّق بجھا ہوا سا تنور
ذہن میں پُر فشاں ہیں ماہ و سال
ربط کی سعی میں ہیں ماضی و حال!
پارۂ گوشت بر سرِ چنگال!

نیند نے ڈال دی ہے اپنی کمند
سو گیا ایک ریچھ کے مانند
اوڑھ کر برف کا مہیب لحاف
اک خلش رہ گئی ہے زیرِ ناف

راں! شانے کھُلے ہوئے مو باف

خشتِ بے جاں بنانیوالے ہیں
اس کی ضو کو بجھانے والے ہیں
سُرخ ہیں اسکے خواب کے دامن
تنگ دل تیرگی کا ایک درپن!
قبر و ایوان یا قبا و کفن

کچھ نہ تھا پاس کیا عدم کے لئے
اک ترازوئے کیف وکم کے لئے
کیا یہ آوارہ و فسردہ روح
اک جفائے سفر سے ہے مجروح
راہ میں مل سکی نہ کشتیٔ نوح!

چند الجھتے ہوئے غباروں سے
اور دھندلکوں کے کوہساروں سے
ماہتاب اور ہمکنار ہوا!
میں بھی کیا کیا ذلیل وخوار ہوا!
آج سورج کا اعتبار ہوا!

شاہراہ
نمبرا

حسن اعرابی

سہاگے کا گیت

چل رے سہاگے سر سر سر، چھن چھن باج رہی گھنگرال
غم سے فضائیں بوجھل بوجھل، درد سے چاروں کھونٹ نڈھال
کون سنے جب تک نہ سنائیں، اپنی بپتا، اپنا حال
چل رے سہاگے سر سر سر، چھن چھن باج رہی گھنگرال

(۲)

گورے جوگی نے دلّی کے چوراہے پر بین بجائی
آزادی کی ناگن پھوں پھوں کرتی بل سے باہر آئی
ناچ ناچ کر بین بجائی، جھوم جھوم کر ناگن ناچی
نغمے تیز و تند ہوئے تو گھوم گھوم کر ناگن ناچی
بستی بستی شعلے بھڑکے، جنگل جنگل لاٹیں[1] لپکیں
سونے والوں نے گھبرا گھبرا کر اپنی آنکھیں جھپکیں
چیخیں گونجیں، اٹھو اٹھو، دوڑو دوڑو، بھاگو بھاگو
آزادی رے، آزادی رے، سنبھلو سنبھلو، جاگو جاگو

[1] شعلے

پیچھے پیچھے آزادی اور آگے آگے بھیڑیں دوڑیں
کاریں لپکیں، لاریاں جھپٹیں، انجن چیخے، ریلیں دوڑیں
دہشت پھیلی، وحشت جاگی، ہر جانب شمشیریں چمکیں
نیزے تیر سے، خنجر برسے، لہو بھری کرپانیں چمکیں
خون سے ندی نالے جل تھل، پنجر الجھے پگ پگ پگ پگ
انسانوں سے جان بچا کر انساں دوڑے ڈگ مگ ڈگ مگ
پاکستان آئے تو سمجھے جان بچی اور لاکھوں پائے
لیکن نارے! سامنتی دنیا میں کون کسی کو بھائے
غم سے فضائیں بوجھل بوجھل، درد سے چاروں کھنٹ نڈھال
سر سر سر سر کھینچ سہاگہ، چھن چھن چھن چھنکا گھنگرال

(۳)

سادا جیون جلنے پہ نارے! تجھ کو ملا ساتھی تو پھنسا
مجھ کو مثالِ زلو دوہری تہری ٹھوڑیوں والے آقا
آقا جو مالک جاگیروں کے اور پیر بھی کہلاتے ہیں
انسانوں کے حق میں قسمت کی شمشیر بھی کہلاتے ہیں

جو مذہب کے پردے میں تقدیر پرستی پھیلاتے ہیں
اپنے خدائی حق کا چرچا بستی بستی پھیلاتے ہیں
سینہ تان تان کہتے ہیں "دیکھ! زمیں تیری ہے کہ میری
اس دھرتی پر چالو مولا مہر نگیں تیری ہے کہ میری"
ہم مزدور، کسان، مزارع، کامے، کمّیں، بھنگی، بابو،
سب ان کی نظروں میں ہیٹے، سب انکی نظروں میں یابو
ان کے کچوکوں سے زخمی ہے تیرا سینہ، میرا سینہ
ان کی جاگیروں کا نمک ہے تیرا پسینہ، میرا پسینہ
نارے! کب تک ہم اس اپنے گھر میں بھی برباد رہینگے
کب تک اپنے خون کے پیاسے ڈھکے چھپے شدّاد رہینگے
کیسے بدلے گا جب تک ہم خود ہی نہ بدلیں اپنا حال
سر سر سر کھینچ سہاگہ، چھن چھن چھن چھنکا گھنگرال

(۴)

نارے! ہم دھرتی کا سینہ چیریں، بوئیں، کاٹیں گاہیں
اس محنت کے بدلے پائیں گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں

کتنے مہینے محنت کر کے ہم غلّے کے ڈھیر لگائیں
اک دن چودھری صاحب آئیں چھکڑے بھر بھر کر لیجائیں
سو من کے انبار سے اپنے حصّے میں آئیں دس دانے
یا کھلیانوں پر منڈلاتے بٹوارے والوں کے ترانے
آندھی آئے، آندھی جائے، اُڑتی دھول رہے خرمن میں
ٹڈی دَل بھر جائے پل میں اپنی آشاؤں کے چمن میں
آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گندم کا زرّیں اُجالا
میری دُنیا پر چھا جائے حسرت وغم کا بادل کالا
مٹھی بھر دانوں سے پیارے، تو ہی بتا، کس کس کو پالوں
پیٹ بھروں بیوی بچوں کا یا میں اپنی جان سنبھالوں
سکّوں میں ڈھالوں غلّے کو جیب بھروں سرکارِ وطن کی
بیوی بچّوں کا تن ڈھانکوں فکر کروں یا تیرے بدن کی
مجبوراً قرضہ لے کر ہم زرعی اوزار خریدیں
چند ٹکوں کی خاطر ترّوں والوں کی بیگار خریدیں
خانم کے باورچی خانے کی ہو کر رہ جائے بیوی

رستہ تکتے پک جائیں آنکھیں، کب روٹی لائے بیوی
تیکھے نیکھے سینگوں والے! کب تک ہم بدحال رہینگے
کب تک ہم مجبور رہیں کہ کب تک ہم پامال رہینگے
کیسے بدلے گا جب تک ہم خود ہی نہ بدلیں اپنا حال
سر سر سر سر کھینچ سہاگہ، چھن چھن چھن چھنکا گھنگرال

(۵)

بھینسے! تو چپکے چپکے مُسکائے، میری ہنسی اُڑائے
ہم کیوں اپنے وطن سے بھاگم بھاگ تمہاری نگری آئے
کیا ہم آئے ریگستانوں کی سُنسان خلا بھرنے کو؟
ریشم پوشوں، توندوں والوں کی اندھی خدمت کرنے کو
غلّہ پیدا کرنے، توندیں بھرنے، خود چھلکے کھانے کو؟
جاگیروں کی سبز کھاد یا گردِ مسافت بن جانے کو
ہم آئے کہ ہمارے لہو سے پاک انساں پیمانے بھرلیں؟
ہم سے حرم، مطبخ، فیکٹریاں، جیلیں اور میخانے بھرلیں؟
پاک انساں دل لینے دل دینے کے طور طریقے سیکھیں؟

حور و غلماں سے خدمت لینے کے طور طریقے سیکھیں؟

انکے پاس عمامے بھی ہیں، منبر بھی ہے، داڑھی بھی ہے!
ان کے حرم میں برقع بھی ہے چادر بھی ہے ساڑھی بھی ہے!

پاک انساں تو رتیاراتوں ناچ گھروں میں عیش اڑائیں
ہم بہم سے سپنے بن بن کر کٹیا ہی میں سو جائیں؟

پاک انساں برفیلے کمروں میں پنکھوں کے نیچے اونگھیں
ہم تپتے ریگستانوں میں جھاڑی جھاڑی سایہ سونگھیں؟

پاک انساں صابن مل مل کر دن میں سو سو بار نہائیں
ہم بدبخت غلاظت کے ڈھیروں میں سڑ سڑ کر دب جائیں؟

بھینسے! تو نے ٹھیک کہا ہے ہم بے کھوٹ نہیں ہیں بھائی
ہم بے ووٹ نہیں ہیں بھائی، ہم مد ووٹ نہیں ہیں بھائی

ملت سے غداری کے انعام میں یہ پائیں جاگیریں
خدمتِ قوم و وطن کے بدلے ہم کو ملیں سو سو تعزیریں

کیوں جرمِ بسیار خوری پر بھی ہیں سزا سے بری وہ توندیں
جو کروٹ کروٹ دنیا کے پالنہاروں کی پت روندیں

آقایاں ز سلام بر نجند، کیسے شکوے میں لب کھولیں
زخمی سانپ کی صورت کب تک چپکے چپکے ہی بس گھولیں
تیری اک ٹکّر کی بھی تو مار نہیں یہ رستم سارے
تیرے سینگ نکیلے خنجر، تیرے کھُر شمشیر ہیں پیارے
سر سر سر کھینچ سہاگہ، چھن چھن چھن چھنکا گھنگرال
اب ہم دم لیں گے تو بدل کر اپنی دنیا، اپنا حال

(۶)

میرے نارے، میرے بھینسے اور فلک کی آنکھیں لال
چل رے سہاگے سر سر سر چھن چھن باج رہی گھنگرال
موٹے موٹے اڑیل ڈھیلے گردش گردش گھستے جائیں
تیرے رگڑے میں آ کر پھُس پھُس پھُس پھُس پستے جائیں
تیرے گرد اگرد بکھرتی آندھی اور بگولے ناچیں
پیلی پیلی گرد کے سن سن لہراتے مرغولے ناچیں
ہر پھیرے میں اکھڑی اکھڑی گھانس ٹوٹی جاتی ہے چُر مُر
گھُل مِل کر جھنکار میں گونجے نارے اور بھینسے کی غُر غُر

کھیت میں اونچے نیچے سیارے سبھی ہموار ہوئے جاتے ہیں
آفاق و اطراف دما دم لالہ زار ہوئے جاتے ہیں
دُور کسی زیتون پہ بیٹھی فاختہ گائے تُم تُم تُم تُم
اس دھرتی پر اب سے ہمیشہ راج کریں گے ہم تم ہم تم
آج سے ذرّہ ذرّہ، پتّی پتّی، کلی کلی خوش حال
چل رے سہاگے سر سر سر سر چھن چھن باج رہی گھنگرال

خاطر غزنوی

گیت

اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
چلتی آندھی رُک نہیں سکتی
اُڑتی بدلی جُھک نہیں سکتی
ننھی لہریں روک سے بن جاتی ہیں بڑی منجدھار
اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
کوئی قلم کو توڑ بھی ڈالے
ہونٹوں پر پڑ جائیں تالے
لیکن پھر بھی سانچ کی ہو گی ہر سوچ جے کار
اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
او چیخوں سے ڈرنے والے
انگلی کان میں دھرنے والے
اُڑتا پنچھی قیدی ہو کر او رمچائے رار

اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
تانیں گہری ہو جائیں گی
لہریں زہری ہو جائیں گی
چاروں کھونٹ بکھر جائے گی میری ہاہاکار
اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
لاکھ مٹا، آباد رہیں گے
گیت سدا آزاد رہیں گے
پائل چاہے قید ہو لیکن قید نہیں جھنکار
اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار

ادب لطیف
مارچ

خلیل الرحمٰن اعظمی

اجنبی سائے

ابھی ہیں آس لگائے یہ زیست کی راہیں
کبھی تو غم کے چراغوں سے پھول برسیں گے

یہ دھوپ چھاؤں یہ ملتے ہوئے حسیں پردے
یہ اک غبار سا چھایا ہوا فضاؤں پہ
یہ آرزوؤں کی دنیا میں سرمئی بادل
ہے ایک نیند سی طاری ابھی ہواؤں پہ

ابھی تو ان کی طرف سے پیام آیا تھا
ابھی تو کان میں گونجے تھے دور کے نغمے
مگر فضا میں یہ کیوں ہیں سکوت کی لہریں
طویل خواب میں شاید ہیں آج ویرانے

کبھی کبھی تو امیدوں کا جال ٹوٹا ہے
مگر نگاہ میں پھرتی رہی وہ اک تصویر
دلِ حزیں نے پرانے غموں سے اکتا کر
بنا لی اپنی محبت کی اک نئی تقدیر

وہ چھٹ رہی تھی دھندلکے نکھر رہی تھی فضا
مگر ہے بڑھ چلی کیوں آنکھ کی یہ حیرانی
وہ جگمگائے تھے قلب و نظر کے بت خانے
یہ آرہے ہیں نظر اب بھی کیوں وہی چہرے

نئے افق سے وہی آفتاب نکلا ہے
یہ سوچ میں دل مجبور ہے کہ اب کیا ہو
وہی ہے خوابِ جوانی وہی نگاہِ قتیل
تلاش کرلیں کوئی ان جفاؤں کی تاویل

بہت دنوں سے ہیں لرزاں یہ اجنبی سائے
ہزار بار جنونِ وفا ہوا عریاں
مگر وہ چشمِ عنایت ہے نیم باز ابھی
مگر وہ حسنِ دو عالم ہے ایک راز ابھی

ساحر لدھیانوی

شکستِ زنداں

چینی شاعر یانگ سو کے نام ———
جس نے چیانگ کائی شیک کے جیل میں لکھا تھا:-

"بیس سال قید ———
کاغذ کے ایک پرزے پہ لکھے ہوئے چند الفاظ کی بنا پر
ہو سکتا ہے کہ میں بیس سال تک سورج کی شکل نہ دیکھ سکوں
لیکن کیا تمہارا یہ فرسودہ نظام جو لمحہ بہ لمحہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی موت
کی طرف بڑھ رہا ہے،
بیس سال تک زندہ رہ سکے گا؟"

خبر نہیں کہ بلاخانۂ سلاسل میں — تری حیاتِ ستم آشنا پہ کیا گذری
خبر نہیں کہ نگارِ سحر کی حسرت میں — تمام رات ——— چراغِ وفا پہ کیا گذری

مگر وہ دیکھ ——— فضا میں غبار سا اٹھا
وہ تیرے سُرخ جوانوں کے راہوار آئے
نظر اُٹھا کہ وہ تیرے وطن کے محنت کش
گلے سے کہنہ غلامی کا طوق اُتار آئے

اور لوہے کی سلاخوں میں بدل جاتا ہے

بیڑیاں روتی ہیں، زنجیریں فغاں کرتی ہیں

کوڑے چیخ اُٹھتے ہیں جلّادوں کی خونخواری پر

دوست، صدیوں سے ہے قائم یہ تشدّد کا نظام

آج اہنسا کے پجاری ہیں محافظ جس کے

دھارے اس وادیٔ خاموش میں تھم جاتے ہیں

آنسو آنکھوں سے ٹپکتے نہیں جم جاتے ہیں

نالے بے سود ہیں، بیکار ہے فریاد یہاں

ہم ہیں صید اور ہر اک ذرّہ ہے صیاد یہاں

اپنے ہاتھوں سے تشدّد کو مٹانا ہوگا

آہن و سنگ کی دیوار کو ڈھانا ہوگا

نیا پرچم
نمبر ا

شاد عارفی

"الّو" سے "اجرا" تک

مجھ کو تنہا چھوڑ دو، شعر و ادب خطرے میں ہے

فن برائے زندگی یا للعجب خطرے میں ہے

کون جانے جرم کیا ہے۔ بے سبب خطرے میں ہے

اس نگوڑی شاعری میں کیا دھرا ہے چھوڑیئے

آپ ہندی ہیں تو اردو کیا بلا ہے چھوڑیئے

دیکھئے پنجرے میں "توتا"[1] چیختا ہے، چھوڑیئے

میں کبوتر کھولتی ہوں آپ دانہ ڈال دیں

ورنہ ان سب کیلئے بچّو[2] کو بلّی پال دیں

آپ تو وہ ہیں غزل گوئی میں صدمہ ٹال دیں

قطعے لکھیئے، نظم گھڑ لیجیے، غزل کہہ لیجیے

مصلحت آئے جو مانع بے محل کہہ لیجیے

"خط نہ ملنے" ڈاک خانوں کا خلل کہہ لیجیے

لہ طوطے کا یہی املا درست ہے۔ ٢ہ بچے کا نام۔

ہو چکے ہیں بند۔ جونیؔ کے رسالے آئیں کیا

(جب رسالے ہی نہیں تو شاعری فرمائیں کیا

تیسرے درجہ کے آمرتے ہیں۔ اُن پہ جائیں کیا

یہ جو طاقوں میں پڑے سڑتے ہیں کیا کچھ بھی نہیں)

عورتوں کے واسطے ... مردوں کے لائق ؟ جی نہیں

جانِ من ؟ جو پی چکا ہوں میں وہ تو نے پی نہیں

پوچھ سکتی ہوں کہ ٹوٹا ہن پہ تندرؔ کس لئے

"فن برائے زندگی" بجلیوں کے اندر کس لئے

"کوزۂ" رجعت پسنداں میں "سمندر" کس لئے

(تم نہ سمجھو گی کہ کیا ہے آج اُردو کا مقام

آچکا ہے جس صحافت کا صفِ اوّل میں نام)

ہند و پاکستان اس پہ رکھ رہے ہیں اتہام

دوست کو دشمن سمجھ لینا ہی دانائی نہیں

کوئی جائز نکتہ چینی وجۂ رسوائی نہیں

معنویت لیجئے۔ الفاظ پیمائی نہیں

سلہ بجلی۔

ہے وہی زندہ ادب جو ارتقا کو گدگدائے
وہ نہیں جو آسماں پر آہ کی تھگلی لگائے
احمقوں کی شان میں لمبے قصیدے۔ ہائے ہائے

عہدِ حاضر میں یہ "چھا نیل ازم" چل سکتی نہیں
"باز" کا پرچار کر کے "چیل" پل سکتی نہیں
لوگ کس..... ٹھنی کو کہتے ہیں کہ پھل سکتی نہیں

خامیوں پہ طنز جب قید و قفس کی بات ہو
سینکڑوں پر جائیگی دو چار دس کی بات ہو
نظم کہنی چھوڑ دوں کیا میرے بس کی بات ہے

دوپہر سے آپ میں کچھ شاعرانہ موڈ ہے
پینسل کب تک بنے گی والہانہ موڈ ہے
چھت کا نظروں کو بنا لیجے نشانہ ___ موڈ ہے

ظہیر کاشمیری

پاگلو!

ہی ہی ہا ہا
ہو ہو ہو ہو
لپاڈکی
کھینچا تانی
دھینگا مشتی
یہ سب کیا ہے

پاگل خانہ
سب کا گھر ہے
سب کا دامن
اپنا سمجھو
شور نہ ڈالو

میز نہ توڑو
دیواروں کی
میل اتارو

اس میں رہ کر
جینا سیکھو
اس سے بچ کر
بھاگ سکوگے؟
بھاگ بھی جاؤ
کہاں رہوگے
اس کے علاوہ
پاگل خانہ
کوئی نہیں ہے

عبدالحمید عدمؔ

غزل

درد کی واردات ہے پیارے — داستانِ حیات ہے پیارے

تیری آنکھوں کا بھی بھروسہ کیا — عالمِ حادثات ہے پیارے

کون اس سلسلے کو ختم کرے — تیری زلفوں کی بات ہے پیارے

آنکھ کی ہر حسین نادانی ! — رونقِ کائنات ہے پیارے

صبحِ محشر تو آ ہی جائے گی — رات کٹنے کی بات ہے پیارے

زندگی کے ستم کو کیا کہیئے — صورتِ واقعات ہے پیارے

بات سُن لے ترا بھلا ہوگا — دردمندوں کی بات ہے پیارے

مستقل موت کی تمنّا ہے — آرزوئے حیات ہے پیارے

ہم عدمؔ اور بادہ پیمائی
کہنے سننے کی بات ہے پیارے

نقوش
خاص نمبر

غلام ربانی تاباں

جیل میں کسی کا خط پاکر

فصلِ بہار میں بھی اسیرِ قفس ہوں میں
گلزار کی فضا کو مرا انتظار ہے

رنگِ فریب کوش کو ہے میری جستجو
بوئے گریز پا کو مرا انتظار ہے

تکتے ہیں میری راہ خیابانِ کیف خیز
دشتِ جنوں فزا کو مرا انتظار ہے

جیسے فسردہ ہو گئی بزمِ صدا و ساز
یارانِ خوش نوا کو مرا انتظار ہے

سُونے پڑے ہیں منبر و محرابِ میکدہ
رندانِ با صفا کو مرا انتظار ہے

اے دوست غم کے گہرے اندھیروں میں آج بھی
اک اخترِ وفا کو مرا انتظار ہے

یہ اور بات ہے کہ وہ منہ سے نہ کہہ سکے
اس پیکرِ حیا کو مرا انتظار ہے

ہیں میرے انتظار میں گیسوئے شام خیز
چشمِ سحر نما کو مرا انتظار ہے

اب بھی کھلا ہی بابِ حرم میرے واسطے
اب بھی مرے خدا کو مرا انتظار ہے

جو میرے انتظار میں ہیں ان کو کیا خبر
تہذیب و ارتقا کو مرا انتظار ہے

اُٹھتی ہیں بار بار نگاہیں مری طرف
جمہورِ ایشیا کو مرا انتظار ہے

شعر و شراب و نغمہ و رومان تابکے
اب عرصۂ وفا کو مرا انتظار ہے

نقوش
نمبر ۱

فراقؔ گورکھپوری

بزمِ برشگال

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے

وہ سوز جو تاریکیوں میں شمع جلائے
وہ ساز جو سوئی ہوئی یادوں کو جگائے

پلکوں کے تلے میکدۂ راز کے جلوے
ظلمت میں گناہوں کے چراغوں کو جلائے

کوندا ہو گداز اُف یہ تبسم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک لو جو ستاروں سے چرائے

وہ مستیٔ قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے
وہ چُستیٔ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے

وہ نرم کلائی کہ سکوت آنکھ اٹھائے
آہستہ خرامی کہ فضا وجد میں آئے

وہ شوخیٔ محتاط کے بچتے ہوئے انداز
دُنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے

یہ کم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی،
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے

نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھر دے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے

زلفِ عرق آلود کی وہ تاروں بھری رات
رُوئے شفق آمیز سے پو پھوٹتی جائے

کیوں تیرے غمِ ہجر میں نمناک ہیں پلکیں
کیوں یاد تری آتے ہی آنسو نکل آئے

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھُری ہے جو اُترتی چلی جائے

کچھ ایسی بھی گذری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

آجکل

فیض احمد فیضؔ

شورشِ بربط و نے

پہلی آواز:۔ "اب سعی کا امکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لئے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے
شیرینیٔ لب خوشبوئے دہن اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیٔ دل تفریحِ نظر اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو اب ان میں اُلجھ کر کیا کرلیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نپٹالیں گے
یہ تیرا کفن وہ میرا کفن یہ میری لحد وہ تیری ہے"

دوسری آواز:۔ "ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

یہ بزمِ چراغاں رہتی ہے اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایّام ترے بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گُل کے قدم قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیٔ کاکل ولب شاداب و حسیں گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذّتِ دردِ جگر موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اس ذوقِ نظر کا شکر کرو اس دیدۂ تر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو ان شمس و قمر کا شکر کرو"

پہلی آواز :- گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر ان شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائیٔ شب کا کیا ہوگا انداز سحر کا کیا ہوگا
جب خونِ جگر برفاب بنا جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گُل اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز:۔ یہ ہات سلامت ہیں جب تک اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورشِ بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ مال و حشم یہ لوح و قلم یہ طبل و علم سب اپنے ہیں

احمد ونی

قتیل شفائی

غزل

احترامِ لب و رخسار تک آ پہنچے ہیں
بوالہوس بھی مرے معیار تک آ پہنچے ہیں

جو حقائق تھے وہ اشکوں سے ہم آغوش ہوئے
جو فسانے تھے وہ سرکار تک آ پہنچے ہیں

کیا وہ نظروں کے جھروکے میں معلّق کر دیں؟
جو ترے سایۂ دیوار تک آ پہنچے ہیں

اپنی تقدیر کو روتے رہیں ساحل والے
جن کو آنا تھا وہ منجدھار تک آ پہنچے ہیں

اب تو کھل جائے گا شاید تری اُلفت کا بھرم
اہلِ دل جرأتِ اظہار تک آ پہنچے ہیں!

ایک تم ہو کہ خدا بن کے چھپے بیٹھے ہو
ایک ہم ہیں کہ لبِ دار تک آ پہنچے ہیں

ادبِ لطیف
نومبر

کمال احمد صدیقی

خلوت سے انجمن تک

حسین ہے یہ زندگی ——— ہزار ہا بہت حسین ہے!
پھر ایک بار مدھم اور نحیف ہوتی جارہی ہے روشنی!
یہ صُبح، صُبحِ نو ہے پھر بھی خوف ہے کہیں نہ رات جاگ اُٹھے
——— یہ کیا پھر تو ہمات جاگ اُٹھے؟
مچل رہے ہوں جیسے ساحلی نظارے موجِ پاش پاش میں!
خود اپنی روح اپنے ہی مزاج کے لئے ہوں اجنبی،
میں آج بھی ہوں اپنی ہی تلاش میں،
میں خود سے دُور ہوں، مگر میں خود کو پا ہی لوں گا ——— یہ مجھے یقین ہے!

متاعِ حسن کو دفن کر دیا شکستگی نے ماندگی و اضطراب کے غُبار میں!
نشاطِ حُسن سے الگ، حیات کے خُمار میں

میں جاگتا رہا ہوں رات بھر سحر کے انتظار میں
خمار ایک گہری نیند بن کے دے رہا ہے لوریاں مرے شعور کو
گراں گذر رہی ہے وسعتِ زمین و آسماں مرے شعور کو
حصار میں لئے ہوئے ہیں سیکڑوں ہزاروں زلزلے اور آندھیاں
مرے شعور کو!
یہ میں نے کب کہا کہ مجھ کو انتشار چاہیئے، جنون چاہیئے؟
ہوں مبتلا عجیب کش مکش میں، خلفشار میں:
پکارتی ہے زندگی!
بلا رہی ہے تیرگی!
میں صبحِ نو سے مطمئن نہیں ہوں، میری زندگی کی جد و جہد ارتقا ہے
اک نئی بہار کی،
یہ صبح، صبحِ نو نہیں ہے — دوپہر ہے عین دوپہر ہے ریگزار کی

مرا جنون زندگی نہیں — مجھے سکون چاہیئے —
مجھے وہ نیند چاہیئے کہ جس میں زندگی کے خواب ہوں،

جہاں زمین ہو، مگر زمین کے تمام ذرّے آفتاب ہوں،
وہ خواب چاہتا ہوں جو زمین کے شعور کو عزیز ہیں،
ہر انقلابِ کامیاب کے غرور کو عزیز ہیں!
——مگر وہ نیند لے کے کیا کروں کہ جس میں کوئی خواب ہی نہ ہو
تسلّیوں کے واسطے حضورِ خاطرِ سکوں، دبے ہوئے نگاہ و لمس
کے حسین جذبہ ہائے زندگی کا اجنبی سا اضطراب ہی نہ ہو!
اگرچہ بے نمود ہے،
مرے لئے کوئی وجود ہے تو میرا ہی وجود ہے!
سکون! روشنی ہے خود مرے وجود کی
سکوت! روشنی نہیں ہے، دود ہے!
——یہ پچھلی رات کا خمار تو جمود ہے!
سکوت لے کے کیا کروں، مجھے سکون چاہیئے!!

ہر ایک منظرِ حیات دفعتاً بدل گیا،
وہ آفتاب ڈھل گیا،

اُمنڈ کے آ گئیں ہر ایک سمت سے وہ اُودی اُودی بدلیاں،

ہوائیں سرد ہو گئیں،

فضائیں بے نیازِ گرد ہو گئیں،

اور ایک سرخوشی تمام سطحِ خشک و تر پہ چھا گئی!

یہ کونپلیں، یہ کلیاں اور یہ پتیاں

ابھی اَٹی ہوئی تھیں گرد میں، پھوار میں نہائیں تو نظارہ خیز ہو گئیں!

پھواریں تیز ہو گئیں!

برس رہا ہے مینہ خوب زور سے!

——— یہ آفتاب جو کہ مغربی اُفق کی وادیوں میں اب سوئے زوال ہے

تھکن سے چور چور ہے، نڈھال ہے،

یہی تو چشمۂ حرارتِ حیات ہے،

یہی تو صدرِ بزمِ ممکنات ہے،

وگرنہ برشگال کا کوئی خدا نہیں، صنم نہیں،

یہ مینہ آسمان کا کرم نہیں،

یہ مینہ خود زمین کے سمندروں کا اک اُبال ہے!!

ہزاروں چہرے، جن کو جانتا ہوں میں،
یہ مینہ کی پھوار اُن کے اشک ہیں،
وہ اشک جو زمیں کی قوتوں کو نذر کر رہے ہیں تحفۂ نمو،
زمانہ مانتا ہے (مانے یا نہ مانے) اُن کی شخصیت کو مانتا ہوں میں،
اور اُن کی منزلیں میرے لئے مقام ہائے رشک ہیں!
وہ چہرے اختراعِ ذوق و ذہن و فن نہیں،
(نہ خلقِ ساغر و سبو)

وہ راہب و شیوخ و برہمن نہیں،
کبھی کیا تھا جذب جن کو زندگی کی آڑ میں شعور نے،
اُنھیں کو ڈس لیا تھا گردشِ عبور نے،
اُنھیں کو آج دیکھتا ہوں بادلوں کی آڑ میں!
وہ ندیاں جو خشک ہو گئی تھیں، اُن کے آنسوؤں سے آ گئی ہیں باڑھ میں!!
—— یہ چہرے آج کی حقیقتوں سے دور ہیں
کبھی یہی حقیقتوں کا روپ تھے
یہ آج کی مصیبتوں سے —— تلخیوں، مسرتوں سے دور ہیں،
جو آفتاب ان کے سامنے طلوع ہو نہیں سکا تھا، یہ کبھی اس آفتاب کی دھوپ تھے

یہی کبھی حقیقتوں کا رُوپ تھے!
حقیقتیں، کہ جو گذر گئیں،
حقیقتیں! — یہ آج کی محبتیں، یہ نفرتیں
حقیقتیں! — یہ آرزوئیں اور حسرتیں
حقیقتیں! — یہ پستیاں، یہ عظمتیں
حقیقتیں، جو اپنا کام کر گئیں،
اُنھیں کا عکس ہیں یہ آج کی حقیقتیں!
— یہ چہرے کس قدر عجیب ہیں؟
ہیں آج کی حقیقتوں سے دُور، اور مرے قریب ہیں،
یہی تو میرے خواب ہائے منتشر کی کائنات ہیں،
تصوّرِ حیات ہیں!!

ہوا کی نرم گامیاں،
پھوار اور بوندیاں،
تھمی تھمی، رُکی رُکی سی آہٹیں،

دبی دبی سی سسکیاں!
یہ میرے دل کی دھڑکنوں کے ساز پہ حیاتِ نو کی مسکراہٹیں!
یہ اجنبی نہیں ہیں میرے واسطے، میں ان کا رازداں ہوں،
ان کو خوب جانتا ہوں میں؛

یہی مری حیات ہے،
یہی جہانِ خواب کی طلسمی کائنات ہے!!

حیاتِ ماسوا کی آرزو نہیں،
فضائے ماورا کی آرزو نہیں،
مجھے کسی صنم، کسی خدا کی آرزو نہیں!
مجھے خود اپنی ہی تلاش ہے،
خود اپنی ہی تلاش میں
سمندروں میں ماہتاب و کہکشاں کا رقص دیکھتا رہا ہوں میں
اور اوس کے ہر ایک قطرہ میں شگفتگیٔ گلستاں کا عکس دیکھتا رہا ہوں میں!
میں دیکھتا رہا ہوں ہر نظارہ میرے ذہن پہ مری نگاہ کی خراش ہے!

مری نگاہ گرد و پیش کی حیات پر صداقتوں کی مُہر ہے
مگر مرا وجود بھی تو گرد و پیش کی حیات کے بغیر صرف ایک کُہر ہے!!

——— بہارِ گلستاں میں میری زندگی کا رنگ ہے
خود اپنی الجھنوں سے اب نجات پا چکا ہوں میں،
حیات، اور نئی حیات پا چکا ہوں میں،
خود اپنی ذات کی تلاش تھی اور اپنی ذات پا چکا ہوں میں!
——— مرا سفر سمندروں کا جلترنگ ہے،
میں کامیابِ جستجو ہوں، کائنات پا چکا ہوں میں!
ہزار ہا کہ عرصۂ حیات آج تنگ ہے،
مگر مجھے یقین ہے، یہ زندگی جو اتنی شوخ و شنگ ہے،
اس کے ہات سے سمٹتے دائروں کا ہر حصار ٹوٹ جائے گا،
روایت و قیود کا خُمار ٹوٹ جائے گا!
خرامِ زیست کی ہیں منتظر طویل اور عریض وسعتیں،
مسرّت و سکون رونمائی کے لئے ہیں مضطرب ابھی ہزاروں ہی حقیقتیں!!

میں انجمن کا ایک فرد ہوں، اور انجمن مجھے عزیز ہے!
مجھے اس انجمن کو لوٹنے کی آرزو نہیں،
فرار میری خُو نہیں،
ہے خودکشی گناہ میرے واسطے،
یہ انجمن ہے گوشۂ پناہ میرے واسطے،
حیات میرا فن ہے ــــ اپنا فن مجھے عزیز ہے! ــــ
میں چاہتا ہوں انجمن کی زندگی ــــ
اور انجمن کی دلکشی ــــ
سُنہرے اور روپہلے جال توڑ دے،
جو ہونٹا کے رقص کے لئے وہ تال توڑ دے۔!!
میں چاہتا ہوں انجمن میں نغمۂ حیات جاگ اُٹھے،
شعورِ کائنات جاگ اُٹھے ــــ!!!

کیفی اعظمی

ٹرنک کال

آج اُس نے کیا تھا فون مجھے
اُس کی آواز سُن رہا تھا میں
نرم لہجے، مہکتی سانسوں کے
پھول ہنس ہنس کے چُن رہا تھا میں
وہ کنائے، اشارے، تلمیحیں
وہ لگاوٹ، وہ لذتِ تقریر
کھینچ دی تھی فضا کے سینے پر
شوخ فقروں نے نقرئی سی لکیر
آرہا تھا ہوا کی لہروں پر
لبِ نازک کی لرزشوں کا پیام
میں نے بے اختیار چوم لیا
چھلکا چھلکا ہوا سا رنگیں جام

ذہنِ انساں نے کر دیا آزاد
سب پیادوں کو سب سواروں کو
اُڑ گئے نامہ بر کبوتر آج
سونپ کر راز برق پاروں کو
کچھ نہیں وقت و فاصلہ لیکن
فون" ایکسچینج "کاروبار میں ہے
دستِ انساں کی ہر حسیں ایجاد
اہلِ دولت کے اختیار میں ہے
روز اُس کا پیام آئے گا
روز مژدہ نیا سنائے گی
فون کرنے کو نازنیں کوئی
جب پڑوسی کے گھر نہ جائے گی
آج اس نے کیا تھا فون مجھے
اس کی آواز سُن رہا تھا میں

گوپال متل

صبحِ کاذب

یہ جو اک نور کی ہلکی سی کرن پھوٹی ہے
کون کہتا ہے اسے صبحِ درخشاں اے دوست
مجھ کو احساس ہے باقی ہے شبِ تار ابھی
لیکن اے دوست مجھے رقص تو کر لینے دے
کم سے کم نور نے الٹا تو ہے اک بار نقاب
ایک لمحے کو تو ٹوٹا ہے طلسمِ شبِ تار
اس سے ثابت تو ہوا صبح بھی ہو سکتی ہے
پردۂ ظلمتِ شب چاک بھی ہو سکتا ہے
صبحِ کاذب بھی تو ہے اصل میں دیباچۂ صبح
صبحِ کاذب بھی تو ہے صبحِ درخشاں کی نوید
ایک اعلان کہ ہنگامِ وداعِ شب ہے
قافلہ نورِ سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
جلد ہونے کو ہے خورشیدِ درخشاں کی نمود

مجروح سلطانپوری

غزل

آنکل کے میداں ہیں دو زخمی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے

سنتے ہم تو کیا سنتے اک بزرگ کی باتیں
صبح کو علاقہ کیا شام کے فسانے سے

خودکشی ہی راس آئی دیکھ بدنصیبوں کو
خود سے بھی گریزاں ہیں بھاگ کر زمانے سے

ہیں اسی سے وابستہ یہ چمن کے ہنگامے
گلستاں عبارت ہے میرے آشیانے سے

قطعہ

سُرخ انقلاب آیا دورِ آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے
اب زمین گائے گی "ہل" کے ساز پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
اہلِ دل اگائیں گے کھیت میں مہ و انجم
اب گہر سبک ہوگا ایک جو کے دانے سے

منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حُسن کارخانے سے
عام ہو گا اب ساتھی سب پہ فیضِ فطرت کا
بھر سکیں گے اب دامن ہم بھی اس خزانے سے
عشق کی کسے فرصت دورِ جہد میں مجروحؔ
آج زخمِ سر بہتر دل پہ چوٹ کھانے سے

سویرا
خاص نمبر

(لکھنؤ لیتھو پریس دہلی)

مجید امجد

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

تنگ پگڈنڈی ——— سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی،
نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
آگے ڈھلوانوں کے پار، اک تیز موڑ ——— اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آگے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو گذر جاتے ہیں، آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے، ڈگمگاتے رہرووں کے قافلے،
ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں؛
آہ ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی ———
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

مخمور جالندھری

اونچی دکان پھیکا پکوان

وہ منتظر ہیں
کہ میں سناؤں عظیم ہندوستاں کا نغمہ
جمی ہوئی دیکھتا ہوں میں جن چوٹیوں پہ کوڑھ کی سپیدی
وہ چاہتے ہیں
میں اُن ہمالہ کی چوٹیوں پر بلند و سیمیں کلس دکھادوں
سیاہ پتھر جو دیکھتا ہوں
اُنھیں بتادوں کسی حسینہ کی نازنیں انگلیوں میں نیلمیں نگینے
نگارِ ہندوستاں کے سینہ پہ بہہ رہے ہیں لہو کے دو تیز گام دھارے
وہ چاہتے ہیں
میں گنگا جمنا کی رہگزاروں میں نور پگھلا ہوا بچھادوں
چمکتے پیتل کو زر بنادوں
میں ——— "کائیں کائیں" کو مست "کُو، کُو" کا نغمۂ جانفزا بنادوں

بتا رہے ہیں ــــــ
مبالغہ ہی کمالِ فنِّ سخنوری ہے

(۲)

دو تاک میں ہیں
فریب کھا جاؤں اور پھر اپنے حلقۂ اقتدار کو بھی فریب دیدوں
دکھا چکا ہوں جنھیں اُجالا اُنھیں تیرہ روزیوں کے سپرد کر دوں
یہ رُوح فرسا گناہ سرزد کبھی نہ ہوگا
اُٹھاؤ کاغذ کے یہ تراشے!
کہ جن پہ شاہنشہی کے دھبے ہیں ثبت ابتک
کہ جن سے ذلّت فزا غلامی کی بُو بدستور آرہی ہے
کسی بھی قیمت، کسی بھی اُجرت پہ میری دُنیائے غم میں بکتی نہیں صداقت
ہٹاؤ ــــــ یہ زرنگار منصب!
یہ کُنبہ پرور ــــــ یہ حرص افروز ــــــ اور یہ رشوت طلب ذریعے!
کہ سنگ ریزے کو سنگ ریزہ کہوں گا میں تو
اُٹھاؤ ــــــ پستول بھر دو میرے نحیف سینے میں معدنی بیج گولیوں کے
صلیب پر کھینچ دو مجھے کیل ٹھونک دو میری خستہ قسمت ہتھیلیوں میں
لگا دو میرے لبوں سے بِس کا بھرا پیالہ

کہ سنگ ریزے کو سنگ ریزہ کہوں گا میں تو

(۳)

جو تاب ضربِ خلوص کی لاسکو تو پھر میں تمہیں سناؤں
حقیرِ ہندوستاں کا نغمہ!
نظر اٹھاؤ!
تمہیں ضیا بار کرسیوں پہ غلیظ مٹّی کے بُت ملیں گے
جو اپنے منصب کے عہد کو لمحۂ غنیمت سمجھ رہے ہیں
نچوڑتے ہیں لہو جو افلاس کے نچوڑے ہوئے بدن سے
پرے وہ دیکھو!
مکاں کھڑے ہیں —— کہ جیسے اپنی عدم تباہی پہ شرم سے نیچے آرہینگے
یہ گھر ہیں آزاد ہستیوں کے
مقیم انساں ہی نہیں ان میں مکّھیوں، مچھروں کے اُڑتے ہجوم بھی ہیں
ذرا سا اور ان کے پاس آؤ!
یہ نسلِ آدم کے آشیاں ہیں کہ —— کہنہ امراض کے گھروندے؟
ادھر بھی دیکھو!
یہ شاہراہ طویل ہے جیسے کوئی اُدھڑی ہوئی چٹائی
شکستہ راہیں نہ جانے کس طرح ہوں گی منزل نما تعجب!

یہ جن منازل کی شاہراہیں ہیں وہ منازل بھی خوب ہوں گی
شکستہ راہوں کے رہنما کو جو قابلِ اعتماد سمجھے تو راہرو کی ستم نصیبی!
اُٹھو مجھے فیصلہ سُنا دو!
لگا دو میرے لبوں سے بِس کا بھرا پیالہ
کہ سنگ ریزے کو سنگ ریزہ کہہ رہا ہوں

مسعود حسین خاں (ادیبم)

غزل

ابھی چمن میں کوئی فتنہ کار باقی ہے — بہار باقی ہے زخمِ بہار باقی ہے

یہ انتظار کی گھڑیاں کنارِ جوئے چشم — امید ڈوب چکی انتظار باقی ہے

تمہارے رُخ پہ ہیں کچھ اجنبی نظر کے نشاں — تمہارے ابرو پہ ہلکا سا بار باقی ہے

طلسمِ غیر نہیں تارِ عنکبوت سے کم — ہزار ٹوٹ چکا ہے ہزار باقی ہے

سُنا ہے ہند کی شاداب وادیوں میں شفق — بہار آ بھی چکی ہے بہار باقی ہے

عجب نہیں ہے کہ شبنم سے موت ہو جائے — گلوں کی تشنہ لبی بے شمار باقی ہے

وہ نو بہار سلامت رہے بتائیں کیا — کہاں سے دامنِ گل داغدار باقی ہے

رفو کی بات پہ وہ شوخ ہنس کے یوں بولا — ابھی تو جیب و گریباں میں تار باقی ہے

مری بہار کی آسودگی میں اے مسعودؔ
سُنا ہے تو ہی فقط بے قرار باقی ہے

معین احسن جذبی

غزل

دل میں کچھ سوزِ تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اس اندھیرے میں اُجالے کے سماں ملتے ہیں

وہی دیوانگیٔ شوق، وہی تیشۂ غم
راہ چلئے تو وہی کوہِ گراں ملتے ہیں

آج بھی کلیوں کے رخسار سے اُڑ جاتا ہے رنگ
آج بھی پھول ملول و نگراں ملتے ہیں

آج بھی ریگِ بیاباں پہ نقش لرزاں ہیں
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے نشاں ملتے ہیں

آج بھی جسم اسی طرح فگار و مجروح
آج بھی قلب اسی طرح تپاں ملتے ہیں

آج بھی دل ہیں کہ ہے حشر کا دھوکا جن پہ
آج بھی لب ہیں کہ سرگرمِ فغاں ملتے ہیں

آج بھی سر سے گزر جاتی ہیں امواجِ بلا
آج بھی اپنے ابھرنے کے نشاں ملتے ہیں

ہاں اسی منزلِ صد کیف و طرب کی جانب
قافلے آج بھی اشکوں کے رواں ملتے ہیں

اے مرے ہمسفرو! اس کو تو منزل نہ کہو
آندھیاں اُٹھتی ہیں طوفان یہاں ملتے ہیں

ان کے ہر وعدۂ الطاف کی رنگینی میں
کتنے نادیدہ ستم ہائے گراں ملتے ہیں

ان کی محفل میں وہ بہکے ہوئے ہیں نغمے
اب تو کچھ دن سے بہ اندازِ فغاں ملتے ہیں

یوں گوارا ہے یہ خونبارئ افق کا منظر
اس کے پرتو میں ہمیں تازہ جہاں ملتے ہیں

نقوش
آزادی نمبر

ملک حمید ؎

ایک نظم

آج انسان کا بہروپ نہیں ہے کوئی
کوئی بندہ ہے، نہ معبود، نہ آقا نہ غلام
آج انسان ہے خود اپنے مقدر کا خدا
ایک دستورِ تعین ہے ستاروں کا خرام

آدمی خود آپ ہے اپنے مقدر کا جواب
کوئی تقدیر کوئی خالق تقدیر نہیں

آسماں آج پراسرار نہیں، واہمہ ہے
آج ذرات کی تابش سے ہے سورج بھی خجل
آج ہے ساغرِ جمشید خود انساں کا شعور
آج رقصاں ہیں حبابوں پہ بھی خیر کنول

نہیں کچھ بھید گرانمایہ و بے مایہ میں
آج ہر شے کیلئے اپنا مقرر ہے مقام
اب کوئی رفعت و پستی کا تخیل ہی نہیں
اب نہ عظمت ہے، نہ تحقیر، نہ دانہ ہے نہ دام

جلد بازی نہیں ہر چند ہماری فطرت
آج خود وقت ہے بجلی کے جھلاوے کا حریف
برق کے حلقہ بگوشوں میں ہے ہر اک موسم
اب نہ گرما ہے نہ سرما، نہ ربیع اور نہ خریف

ہائے یہ میرا وطن، اب بھی یہاں باقی ہے
وہی دستورِ کہن اور وہی فرسودہ نظام

اہلِ محفل بھی وہی، صاحبِ محفل بھی وہی
اب بھی ذہنوں پہ مسلط ہیں پرانے اوہام

صبر کا اجر بھی ملتا ہے، یہ مانا ۔ لیکن
خود پہ ہر جبر گوارا بھی کریں تو کب تک؟
جس کو آئینہ و شانہ ہی سے فرصت نہ ملے
ایسے خود بیں کو اشارہ بھی کریں تو کب تک؟

اپنی ہمت ہے کہ بیدار ہیں بشاش ہیں ہم
پیٹ میں آگ ہے چہروں پہ ہے گردِ آلام!
صف بہ صف معرکہ آرائے ستم ہونا ہے
ساتھیو! ایسے بڑھو گونج اٹھے نغمۂ گام

ذوقِ منت کشِ آداب رہیگا کب تک
ہے ضرورت کہ ہمیں سے نیا فرہاد اٹھے
ساتھیو! آگ بنو، شعلہ کی مانند اٹھو
سینۂ دشت سے جیسے کوئی فریاد اٹھے

ساتھیو! آؤ ہمیں کوہکنی کرنا ہے
جانتے بوجھتے بھی کوہکنی کا انجام
ہم کو منظور ہے ہنستے ہوئے پی لینگے اگر
زندگی کیلئے پینا ہی پڑا موت کا جام

ہم رہے لاکھ اسیرانِ غمِ بیش و کم
پھر بھی منصوبۂ بندش پہ ہنسی آتی ہے
ظلم بھی سہتے رہیں اور پرستش بھی کریں
اس تمنائے پرستش پہ ہنسی آتی ہے

ساتھیو! ہم کو ہمالہ کو اُڑا دینا ہے — یہ ہمالہ کہ جو چھوتا ہے فلک کے در و بام
اپنے زنداں کی ہے دیوار، کہ جو روکے ہے — نئے سورج کی حیات آفریں کرنوں کا خرام

ساتھیو! آج بھی سورج پہ گہن ہے کہ جو تھا — وہ گہن جس کو روایات کہا کرتے ہیں!
عرصۂ زیست پہ ہے چھائی ہوئی آج بھی تو — وہی ظلمت کہ جسے رات کہا کرتے ہیں!

نکہتِ خوں، رنگِ شفق ابھرے گا بالائے افق — ہم کو لینا ہے ابھی اک نئے سورج کا سلام
مفتیٔ شہر نہ ہوگا، نہ کوئی قبلۂ دیں — مقتدی بھی ہمیں ہوں گے، ہمیں خود اپنے امام

نئے پیمان

ممبرا

منیب الرحمٰن

رات ساکت ہے......

رات ساکت ہے، ستاروں کا سفر جاری ہے
عارضِ وقت پہ ہیبت کا فسوں طاری ہے
سو گئے صدر نشینانِ دبستانِ جنوں
اپنے سینے سے لگائے ہوئے منشور اپنے
نیم غفلت میں سُناتا ہے کوئی حالِ زبوں
کوئی چلّاتا ہے خود چھیڑ کے ناسور اپنے
قید خانوں میں ہے ہنگامۂ دیروز وہی
دعوتِ چشم وہی، ساز وہی، سوز وہی

(۲)

شیشہ و جام و سبو آج بھی خالی ہی سہی
اور عشرت کی طلب خام خیالی ہی سہی

پھر بھی اے مُردہ تمنّا دل پہ رونے والو!
دیکھو سینوں میں نیا جذبۂ بیداری ہے
بدلا بدلا سا ہے اندازِ فلک، آگے بڑھو
رات ساکت سہی تاروں کا سفر جاری ہے
رہگذر اور ہو، پہ اب بھی وہی منزل ہے!
وہی لیلیٰ ہے وہی ناقہ، وہی محمل ہے!

نقوش،
عالمگیر امن نمبر

میراجی

غزل

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس سے کہیں
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بُری جیسی بھی گزری ان کے سہارے گزری ہے
حضرتِ دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں

ایک ٹھکانہ آگے آگے، پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دُوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں، تو مبادا دونوں باہم کچھ احسان کریں

دستِ مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے برباد ئی ہر ایوان کریں

میر ملے تھے میراجی سے، باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

ن۔م۔ راشد

ایران میں اجنبی

ملاقاتِ اوّل میں نوروز بولا:
"میں اک کارگرِ رنجبر ہوں،
سوادِ کتابی کی لذّات سے بے خبر ہوں:
مرا سن ہے تیّ چپن سے اُوپر،
مگر میرے بالوں میں اک تارِ خاکستری تک ہویدا نہیں ہے
وہ خوش بخت ہوں،
جس کی دو بیویاں ہیں
جواں سال و رعنا
اور اُن میں، خیابانِ شاپور کی رہنے والی،
مری ہژدہ سالہ زُلیخا،
جمیل و جواں تر ہے،
اسفند کی شمعِ رخشندہ گوہر ملک سے!

مگر تم یہ باور کرو گے،
کہ ان دو حریفوں کو اک دوسرے کی خبر تک نہیں ہے؟"
وہ کہنے لگا:
"تم اگر آج کی شب
زلیخا کے گھر میں
پنیر اور روٹی مرے ساتھ کھاؤ
تو ہم دونوں ممنون و دلشاد ہونگے!"
محبت کی پہلی کرن تھی،
کہ جس نے ہمارے دلوں سے بھلا دی تھی یادِ وطن بھی!

تو نوروز بولا:
"مگر ہاں یہ سُن لو،
کہ تم نے تمہارے کسی آشنا نے،
جو قربان، میری زلیخا کو فاسد نگاہوں سے دیکھا،
تو یہ تیغ اُس کے ناپاک سینے میں بے شک اُتر کر رہے گا!"

تو جب صبحِ فردا،

ابھی ہم خمارِ شبِ رفتہ سے سرگراں تھے،
ابھی تک دماغوں پہ چھایا ہوا تھا دھواں سا،
ابھی تک نگاہوں میں
حُسن و مئے و رقص و نغمہ کے بکھرے ہوئے تار
قالین سے بُن رہے تھے،
اور اک خوابگوں تیرگی میں،
کبھی ایک دو، اور کبھی سینکڑوں آتشیں جام
ہنستے تھے، گاتے تھے، اور دَور میں گھوم کر ناچتے تھے،
وہ ہر بار جب سامنے سے گذرتے تھے،
اُن میں سے تیر و سناں سر نکالے ہوئے جھانکتے تھے!
کہ جیسے ہماری ہی جانب بڑھیں گے،
ہمارے ہی دہشت سے بے انتہا سرد جسموں کو
بس چیر جائیں گے اک عالمِ بے بسی میں!

کبھی اپنی دیرینہ محرومیاں،
اور کبھی قید و بندِ عمل سے وہ تازہ رہائی

سمجھاتی تھی سرگوشیوں میں:

"یہ دیوانہ گر رات ہو
اور پھر بھی نہ ہو رشتۂ جانستاں تک گوارا؟"
تصوّر دکھاتا تھا، لیکن،

مرے ساتھیوں میں سے اِک مردِ میداں،
کہ جس نے کسی ساعدِ نور کو چھو لیا ہے،
دھڑم سے گرا ہے،
اور اُس کا لباسِ کبودی
ہے سب خوں میں لتھڑا ہوا، پارہ پارہ!

تو نوروز آیا، ہنسا اور کہنے لگا:
"تم بڑے سنگدل ہو،
تمہارا وہ ساتھی تو کل شب وہیں سو گیا تھا،
بہت اسکی دلجوئی کرتی رہی میری گلرو غزالہ،
کہ وہ اپنی مہجور بیوی کی تصویر کو،
سامنے رکھ کے آنسو بہاتا رہا

تہیں کیا مصیبت پڑی تھی
جو تم نیم شب لوٹ آئے تھے
منزل کی آسودگی چھوڑ کر،
ہُو کے عالم میں،
جب کوئے روزن میں
آوازِ سگ تھی، نہ آدائے درباں؟"

وہ مہجور بیوی کی تصویر ـــــــ
وہ ایک گلرو غزالہ کی دلجوئیاں ـــــــ
وہ مرے نیم شب لوٹ آنے کا ارماں ـــــــ
تو، اس پہ رہی سب کے دل میں یہ اُلجھن
کہ ساتھی کے "شہکار" کا راز جانیں!

افسانے، خاکے

ابراهیم جلیس
پرکاش پنڈت
شوکت صدیقی
عصمت چغتائی
فکر تونسوی
کرشن چندر
کنھیا لال کپور
مہندر ناتھ
ہنس راج رہبر

ابراهیم جلیس

جانور

"کل آدھی رات کو مولوی فتح علی گول باغ میں ایک عورت کیساتھ پکڑے گئے"

ہر شخص یہی کہہ رہا، اور پوچھ رہا تھا کہ کیا یہ سچ ہے ـــ؟ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا میں گویا سچ اور جھوٹ کے درمیان کھڑا تھا کبھی خیال ہوتا اتنے لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے کبھی سوچتا، آدمی اندر کچھ اور ہوتا ہے اور اوپر کچھ اور، جو آدمی خول کے اندر ہوتا ہے وہ بالعموم اس آدمی سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے ۔ اب یہ مولوی فتح علی ـــ جن کے ماتھے پہ داغِ سجدہ ہے ۔ ایک بالشت گنگا جمنی ڈاڑھی ہے ۔ محلہ پرانی انارکلی کے معزز اور معتبر آدمی کہ محلے والے اپنے جھگڑے ٹنٹے پولیس تھانے میں طے کرنے کے بجائے انہیں کے پاس چکایا کرتے تھے ۔ پیش امام کی غیر حاضری میں ان کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے ـــ اور تو اور گھر میں ایک نیک بیوی، دو جوان لڑکے، اور تین بالغ لڑکیاں بھی موجود تھیں ۔ اس کے بعد مولوی فتح علی کی یہ شرمناک حرکت ـــ! پھر یہ کہ ان کی عمر کیا ایسے افعال کے لئے موزوں تھی ۔ پنتالیس، پچاس کے لگ بھگ ہو رہے تھے ۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور لب گور بھی عورت ہے ـــ الٰہی توبہ!

بات سارے محلے میں پھیل گئی تھی، بات ـــ باتیں بن گئی تھیں ۔ لوگ ہنس رہے

تھے۔ حیران ہو رہے تھے۔ سُن رہے تھے۔ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا۔ مگر آج مولوی فتح علی دن بھر دفتر نہ آئے تو یقین میں اور مجھ میں بہت تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔ دفتر کے دوسرے کلرک ساتھی کہہ رہے تھے ــــ "اگر یہ بات جھوٹ ہے تو وہ یوں منہ چھپائے کیوں گھر بیٹھ رہے ــــ؟ ضرور کوئی بات ہے"۔ ایک کلرک نے تو چپکے سے سپرنٹنڈنٹ کو ان کی جگہ اپنی ترقی کے لئے درخواست بھی دیدی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ کبھی دفتر نہ آئیں گے ایسے شرمناک واقعے کے بعد ان کے پاس دفتر آنے کی کیا صورت رہ گئی تھی۔

دفتر میں مولوی فتح علی کی واقعی بڑی عزت تھی۔ ہم سب سے سینئر کلرک تھے۔ کام کے اتنے محنتی کہ صبح سات بجے دفتر آتے اور شام کے آٹھ بجے دفتر سے نکلتے۔ ڈرافٹ تو اتنے اچھے لکھتے کہ انگریز افسر تک ان کے ڈرافٹ سے ایک لفظ نہ کاٹتا۔ بس چپ چاپ دستخط کر دیتا تھا۔ تنخواہ نہ زیادہ تھی نہ کم۔ لیکن مہنگائی اور بدحالی کے اس زمانے میں جبکہ ہر کلرک کے خوابوں میں رشوت کے روپوں کے چمکیلے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ مولوی فتح علی نے جائز تنخواہ کے روپوں کے اوپر رشوت کا ایک روپیہ بھی نہیں کمایا۔ اہلِ معاملہ ان کی ہتھیلی چمکانا چاہتے تو وہ مسکرا کر انہیں اپنی ہتھیلی کی لکیریں دکھاتے ــــ ہاتھ میں قینچی ہے روپیہ تو میرے ہاتھ میں ہے ہی نہیں۔ آپ کا کام تو اللہ پورا کر دے گا۔

اس کے بعد وہ خود ہی اس کا کام کر دیتے تھے۔

اس طرح ان کی شہرت پُرانی انارکلی کے علاوہ اس لاہور میں بھی پھیل گئی تھی جو ڈپٹی کمشنر آفس کے ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔

مگر یہی مولوی فتح علی کل آدھی رات کو گول باغ میں ایک عورت کے ساتھ......

دفتر سے گھر جاتے ہوئے راستے میں پاکستان ٹی سٹال کے پاس مجھے غلام محمد ملاحسن نے

اپنی بڑی بڑی خوفناک مونچھوں میں بل دیتے ہوئے پورے غنڈے پن کے ساتھ ایک آنکھ مار کر مجھ سے پوچھا۔

"سناؤ جی۔ بابو جی — آپ کے دوست مولوی فتح علی کہاں ہیں؟"

قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ پوچھوں یا جواب دوں اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جیسے اس کے سوال کا جواب ایک ایسا ہی بھرپور قہقہہ ہو سکتا ہے۔

میں نے اسے روک کر کچھ بات کرنی چاہی مگر اس کے ساتھ کوئی آوارہ عورت تھی جسے وہ سائیکل پر سامنے کے ڈنڈے پر بٹھا کر سوار ہو گیا اور فرار ہو گیا۔

غلام محمد کی اس حرکت کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مولوی فتح علی کی اس شرمناک حرکت کا غلام محمد سے بھی یقیناً گہرا تعلق ہے کیونکہ غلام محمد، مولوی کا ہمسایہ تھا اور یہ ہمسائیگی بہت پرانی تھی۔ پاکستان بننے یا لاہور آنے سے پہلے جب مولوی فتح علی دہلی میں پھاٹک حبش خاں میں رہتے تھے تب بھی غلام محمد اُن کا ہمسایہ تھا۔ فسادات کے زمانے میں جب دہلی لُٹنے لگی، جلنے لگی، مرنے لگی۔ اس وقت یہ خبر کسی نے مشہور کر دی تھی کہ وہ سبزی منڈی کے بلوے میں مارا گیا۔ مولوی فتح علی اس کی بیوی اور بچے کو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے والے پناہ گزین کیمپ میں لے آئے بڑی ڈھارس دی۔ عمر بھر کفالت کا ذمہ لیا۔ مگر ہمایوں کے مقبرے پہنچ کر انھوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ غلام محمد زندہ ہے اور مقبرے کی سیڑھیوں پر بیٹھا اپنے بیوی بچوں کیلئے زار و قطار رو رہا ہے۔ مولوی فتح علی اور اپنی بیوی اور بچے کو دیکھا تو ان کے پیروں پر گر گیا۔ وہ غنڈہ جو پھاٹک حبش خاں کے علاوہ دلی کے دوسرے محلوں میں بھی بدمعاشی اور غنڈہ گردی میں ہیرو مانا جاتا تھا جس نے پولیس کے آگے کبھی سر نہ جھکایا تھا مولوی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بندۂ بے دام ہو گیا۔ پھر دونوں اکٹھے مہاجرین کے

آخری قافلے کے ساتھ لاہور پہنچے اور یہاں آکر غلام محمد نے ایک کے بجائے دو مکانوں پر قبضہ کیا بڑے مکان پر تو خود قابض ہوگیا اور چھوٹا مکان مولوی فتح علی کو دیدیا۔

لیکن لاہور آکر دونوں کے تعلقات آہستہ آہستہ خراب ہوتے گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ دونوں ہمسایہ تھے۔ اور لڑائی شرطِ ہمسائیگی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مولوی فتح علی مسجد تھے اور غلام محمد خرابات ــــ غلام محمد نے یہاں آکر بھی وہی غنڈہ پن شروع کر دیا جس کی بدولت وہ دہلی میں ایک بار جیل بھی جا چکا تھا۔ مولوی فتح علی اس کو ہمیشہ سمجھاتے، مناتے نصیحتیں کرتے، ڈانٹتے، پیار کرتے ــــ غلام محمد ان کا تھوڑا بہت احترام تو کرتا تھا لیکن ایک بار تو اس نے احسان فراموشی کی انتہا کر دی۔

ایک بار رمضان شریف کی رات تھی مولوی فتح علی تراویح پڑھ کر آدھی رات کو گھر لوٹ رہے تھے کہ گول باغ کے قریب ایک عورت کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ مولوی فتح علی دوڑے دوڑے اس کی طرف گئے تو دیکھا کہ غلام محمد اور اس کے تین چار ساتھی ایک چودہ پندرہ برس کی لڑکی کو گھیرے کھڑے ہیں۔ لڑکی نے جونہی مولوی کو دیکھا دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور چیخنے لگی "ــــ مجھے بچاؤ ــــ خدا کے لئے ان غنڈوں سے بچاؤ ــــ خدا کے لئے ان غنڈوں سے بچاؤ۔"

غلام محمد مولوی کا سارا احترام دل سے نکال پھینک کر غرایا۔

"مولوی جی۔ ادھر کیا نماز پڑھنے آئے ہو۔ یہ باغ ہے مسجد نہیں ہے۔ چھوڑ دو، اس لڑکی کو یہ ہماری ہے۔"

مولوی فتح علی نے غلام محمد کو خوب ڈانٹا، پھٹکارا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے جیب سے ایک چاقو نکالا۔ مگر اسی اثنا میں ٹاؤن ہال کی طرف سے آتی ہوئی ایک کار کی روشنی

اندھیرے میں پھیل گئی ۔ غلام محمد اور دوسرے غنڈے بھاگ کھڑے ہوئے ۔ کار جیسے ہی قریب آئی مولوی نے آواز دے کر روک لی ۔ کار میں کوئی رومانوی مزاج جوڑا بیٹھا تھا مولوی نے سارا واقعہ سُنایا اور اسی کار میں اس لڑکی کو بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آئے ۔

دوسرے دن صبح اسی بات پر مولوی فتح علی سے غلام محمد جھگڑ پڑا کہ انھوں نے شیر کے سامنے سے گوشت ہٹا لیا تھا ۔ مگر مولوی فتح علی کہتے تھے کہ انھوں نے اس لڑکی کو نہیں بچایا ہے بلکہ غلام محمد کی بیوی اور بچے کو دوسری بار بچایا ہے ۔

اس واقعہ کے بعد سے مولوی فتح علی اور غلام محمد میں بڑے زوروں کی ٹھن گئی تھی اور وہ مولوی سے بدلہ لینے کی خاطر ان کے خلاف بڑی بے سر وپا ، غلیظ اور واہیات افواہیں اڑانے لگا تھا ۔ میں نے سمجھا کہ کل رات کو مولوی صاحب کا کسی عورت کے ساتھ پکڑا جانا بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے جو گول باغ میں پیش آنے کے بجائے دراصل غلام محمد کے گندہ ذہن میں رُونما ہوا ہے میں غلام محمد کے اس گول باغ والے واقعہ سے بخوبی واقف تھا اسی لئے مجھے یقین ہو گیا کہ غلام محمد نے مولوی فتح علی کو ذلیل کرنے کے لئے یہ آخری حربہ استعمال کیا ہے اور اپنی زندگی کی اس اندھیری اور فحش رات کو زبردستی مولوی فتح علی کی زندگی میں داخل کر دیا ہے ۔ اور اس رات کے منظر میں اپنی جگہ پر مولوی فتح علی کو کھڑا کیا ہے ۔

اب مجھے کچھ اطمینان سا محسوس ہوا ۔ میں نے اپنے گھر جانے کے بجائے پہلے مولوی فتح علی کے گھر جانا مناسب سمجھا ۔ کیونکہ میرے دل سے غلط فہمی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی ۔ اور اب ان سے ملنے میں نہ مجھے کوئی عار تھا اور نہ ان کے شرمانے کا کوئی امکان تھا ۔ راستے میں " اورنگ زیب " ہوٹل کے پاس مجھے عبدالرشید ملا جو میرا اور فتح علی کا مشترکہ

اور گھرا دوست تھا۔ ہم تینوں ہر شام اورنگ زیب ہوٹل میں بیٹھتے ریڈیو پر رات کی خبریں سنتے اخبارات پڑھتے چائے پیتے اور گپیں ہانکتے تھے۔ عبدالرشید آج خلاف معمول شام سے پہلے ہی ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر آواز دی۔

"اوہ ۔۔۔ آؤ آؤ ۔۔۔ تمھیں ایک بڑی حیرتناک خبر سناؤں"۔

اندر جا کر اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑے آزادانہ لہجہ میں بولا۔

"کیا بتاؤں یار ۔۔۔ اپنے مولوی نے تو رات لٹیا ہی ڈبو دی۔ تم نے سُنا رات مولوی ......"

میں نے کہا۔

"ہاں میں نے سُنا ہے۔ مگر میرا خیال ہے یہ جھوٹ ہے۔ اس میں مجھے غلام محمد کی کوئی ناپاک سازش معلوم ہوتی ہے"۔

عبدالرشید نے کہا۔

"نہیں یار کسی کی سازش نہیں۔ مجھے ابھی عید دلا تھا جو یہاں کے تھانے کا سپاہی ہے اس نے مجھے بتایا کہ اسی نے کل رات مولوی کو ایک عورت کے ساتھ پکڑا ہے۔ مولوی اور وہ عورت رات بھر حوالات میں رہے"۔

میں نے پوچھا۔

"وہ عورت کون تھی؟"

رشید نے جواب دیا پتہ نہیں کون تھی۔ بہرحال جو بھی تھی بڑی آوارہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک پینتالیس پچاس کے بوڑھے کے ساتھ چلی گئی"۔

میں نے رشید سے پوچھا۔

"تم آج مولوی سے ملے تھے؟"

رشید نے جواب دیا۔" اب اس سے کیا ملنا ہے اور کیا وہ اب ہم سے مل سکتا ہو؟"

میں نے کہا" آو۔ چلو اس سے ملیں ہمیں تو کم از کم اس سے ملنا ہی چاہیئے۔ سچ پوچھو تو جانے کیا بات ہے مجھے یقین ہی نہیں آتا۔ مجھے یقین کر لینا چاہیئے سب ہی کہہ رہے ہیں اور تم بھی یہی کہہ رہے ہو۔ اس کے بعد شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ مگر۔ مگر اب بھی میرے دل میں شبہ اور یقین میں عجیب سی کش مکش ہے۔"

عبدالرشید نے کہا۔" میں تو اب اس سے ملنے کو بیکار سمجھتا ہوں۔ وہ نہیں ملیگا۔"

میں نے اسے مجبور کیا۔" تم چلو تو سہی ——— یہ سمجھ کر ملیں گے جیسے آخری بار مل رہے ہوں۔"

ہم دونوں اورنگ زیب ہوٹل سے باہر نکلے۔ امرتسری بھائیوں کی تمباکو شاپ تک پہنچے ہی تھے کہ مولوی فتح علی کا بڑا لڑکا، رفیع ملا جو دوائیوں کا بکس اٹھائے جا رہا تھا۔ اور جس کے پیچھے ڈاکٹر سنور علی ایم۔ بی۔ بی۔ایس چل رہا تھا۔ میں نے رفیع سے پوچھا۔

"کیوں رفیع ——؟ کیا بات ہے —— خیریت ہے؟"

رفیع بڑا پریشان، گھبرایا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ اس نے صرف یہی کہا۔

"امی .... امی جی ...."

اتنا ہی کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ عبدالرشید نے یہ سن کر مجھ سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے بیچاری نیک عورت مولوی کی اس شرمناک حرکت کا صدمہ سہار نہ سکی۔"

وہ خاموش چلتا رہا۔ ہم دونوں مولوی کے گھر پہنچے۔ دستک دی۔ ڈاکٹر اندر تھا راشد باہر نکلا اور بولا "ٹھہریئے۔ ابھی اباجی کو بھیجتا ہوں۔"

ہم دونوں کو باہر سڑک پر ہی ٹھہرنا پڑا۔ کیونکہ مولوی کے گھر کوئی بیٹھک ہی نہیں تھی۔ صرف دو کمروں کا گھر تھا۔ اسی لئے مولوی نے اورنگ زیب ہوٹل کو اپنا ڈرائنگ روم دیوان خانہ، بیٹھک سبھی کچھ بنایا ہوا تھا۔

بڑی دیر تک مولوی باہر نہ آیا۔ جب ڈاکٹر باہر نکلا تو ہم نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔؟ معلوم ہوا کہ مولوی کی بیوی نے خودکشی کی خاطر ڈیڑھ تولہ افیون کھالی تھی رفیع پھر ڈاکٹر کے ساتھ غالباً دوائی لینے چلا گیا۔

ہمیں یقین ہو گیا کہ مولوی نے سچ مچ مولویوں کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھا ہے۔ وہ اب ہم سے ملنا نہیں چاہتا۔ ہم واپس جانے ہی والے تھے کہ اچانک میری نظر دروازے پر پڑی جو ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اور جس میں سے مولوی چور کی طرح جھانک رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اور قریب جا کر کہا۔

"مولوی دروازہ کھولو۔ چھپنے سے کیا فائدہ۔ ہم تمہارے بے تکلف اور ہمدرد دوست ہیں اگر تمھیں اب بھی ہماری مدد کی ضرورت ہے تو ہم تیار ہیں۔ ہم اسی لئے تمھارے پاس آئے ہیں۔"

مولوی نے دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے وہ کمرہ نہیں تھا، بلکہ باورچی خانہ غسلخانہ، کباڑ خانہ سبھی کچھ تھا جس میں ایک طرف چولھا تھا۔ دوسری طرف ملکا جھاڑ ٹنک رکھے تھے۔ جھوٹے برتن پانی کی بالٹی کے پاس پڑے تھے۔ مولوی نے ہمیں ٹرنکوں پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور خود میلے کپڑوں کی بڑی سی گٹھڑی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا

مرجھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر ہم تینوں خاموش رہے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا۔

"کیوں بھئی۔ بھابی اب خطرے سے باہر ہیں نا۔!!"

مولوی نے بجھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"ہاں ۔۔۔ بچ گئی۔"

رشید نے پوچھا۔۔۔"کیوں بھئی۔ یہ بات کیا ہوئی تھی۔؟"

میں نے غصّے سے رشید کی طرف دیکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رشید اس وقت کوئی ایسا بات پوچھے جس کا تعلق کل رات والے واقعے سے ہو۔

مولوی نے رشید کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف ۔۔۔ اور پھر یکبارگی تیز اور غصّہ آمیز لہجے میں بولنے لگا۔

"تم میرا گھر دیکھ رہے ہو۔ ایک بڑے مکان کے لئے کوئی پندرہ بیس درخواستیں دے چکا ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ۔ یہی دو کمرے ۔ بلکہ ایک ہی ۔۔ یہ ۔۔ یہ کمرہ ہے؟ اسے کمرہ کہا جا سکتا ہے؟"

وہ ہم دونوں کی طرف دیکھ کر گھورنے لگا جیسے جواب چاہتا ہو۔ جیسے اسے معلوم ہے کہ ہم کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ جیسے ہم اس سے مخاطب نہیں۔ جیسے ہم اس کے روزانہ ملنے والے دوست نہیں۔ بلکہ محکمۂ آبادکاری کے افسر ہیں۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"مجھے پاکستان آئے دو سال ہوگئے ہیں دو سال سے میں اپنی بیوی دو جوان لڑکوں اور تین بالغ لڑکیوں کے ساتھ اسی کمرے میں قید ہوں۔ بتاؤ۔ میں کب تک قید ہوں میں بھی انسان ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ جاؤ، مجھے اسی قید میں گھٹ کر مرجانے دو

یہاں سے چلے جاؤ۔ جاؤ۔"

اور وہ خود ہی اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ اندر سے اس کی بیوی کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ ہم دو تین لمحے وہیں بیٹھے رہے۔ اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔

راستہ بھر رشید بالکل خاموش رہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا بات کی جائے ہم پھر اوڈنگ ریب ہوٹل میں گئے۔ وہاں محلے کا تھانیدار خان ریاض محمد بھی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر چائے پینے کی دعوت دی۔ ہم اس کی میز پر بیٹھ گئے۔ تو اس نے پیالی سے چائے طشتری میں انڈیلی۔ دو گھونٹ پیئے۔ اور چائے میں بھیگی ہوئی اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"یار رشید — وہ تمہارا دوست مولوی فتح علی بھی عجیب آدمی نکلا — اپنی بیوی کو سیر کرانے آدھی رات کو گول باغ چلا آیا — لاحول ولاقوۃ۔ ایسے کاموں کے لئے گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی ......"

رشید اور میں نے یکلخت ایک آواز ہو کر حیرت سے پوچھا۔

"کیا — کیا وہ اس کی بیوی تھی — ؟؟"

تھانیدار اپنی رو میں بولے چلا جا رہا تھا۔

"توبہ، توبہ — انسان جانور سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ اتنی لمبی لمبی ڈاڑھیوں والوں کو بھی پاکستان کی عزت کا کوئی خیال نہیں۔ تو پھر پاکستان کا کیا حشر ہو گا — ؟ — کیوں جی ؟ ؟"

مگر ہم دونوں آبادکاری کے افسروں کی طرح خاموش چپ چاپ بُت بنے بیٹھے تھے۔

جاوید
نمبر ۸

پرکاش پنڈت

مفلوج

مسز گوتم کی کڑی نگرانی کے باوجود انڈوں کی بھرجی بھربھری بننے کی بجائے جھلس گئی تھی اور آلوؤں کی ٹکیوں میں تو مصالحہ اس قدر چھوڑا ہوا تھا کہ پہلے ہی ہیگ پر مسٹر اے۔ وی نروتم داس گوتم نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا "بلاؤ سؤر کے بچے کو۔ الّو کے پٹھے کو ذرا بلاؤ"

لیکن مسز گوتم نے سؤر کے بچے یا الّو کے پٹھے کو بلانے کی بجائے آلو کا ایک ٹکرا منہ میں ڈالتے ہوئے پچکارنے کے سے لہجے میں کہا "کہاں ڈارلنگ! نوکروں کو ہر وقت نہیں کوسا کرتے"

مگر مسٹر گوتم اس وقت کسی قسم کی نصیحت سننے کے مُوڈ میں نہ تھے اور مسز گوتم پر واضح تھا کہ جب وہ اس قسم کے موڈ میں نہیں ہوتے تو کیا کچھ ہوا کرتا تھا۔ نوکروں کے بعد مسٹر گوتم کا تمام تر نزلہ انہی کی ذات پر آن گرتا تھا۔ اگرچہ اپنے تہذیب یافتہ ہونے کی صحت کے مظاہرے کی خاطر وہ انھیں ہمیشہ ڈیر یا ڈارلنگ کے خطاب کے ساتھ ہی مخاطب کرتے تھے۔ مگر موٹی موٹی گالیاں دینے میں بھی کم فراخدلی کا ثبوت نہ دیتے

تھے۔ چنانچہ دبے گلے سے وہ خود بھی نوکروں کی نالائقی، کام چوری اور نمک حرامی کا اقرار کرنے لگ جایا کرتی تھیں۔

"جانتے تو ہو ڈیر"۔ الماری میں سے مچھلی کا ٹین نکالنے کے لئے اٹھتی ہوئیں مسز گوتم نے مسٹر گوتم کے کندھوں پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔" آج کل نوکروں کا کتنا توڑا ہے" اور اس سے پیشتر کہ مسٹر گوتم نوکروں کے توڑے کی بات پر ہی اناپ شناپ بکنا شروع کر دیں وہ مچھلی کے ٹین کو کھلوانے کے بہانے کچن کی طرف نکل گئیں۔

اچانک ہاتھ آ لگنے والے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر گوتم نے جلدی جلدی ایک بڑا سا پیگ بھرا اور غٹا غٹ پی گئے۔ پھر سگریٹ سلگا کر صوفے کی پشت پر اپنی پشت گرا دی اور دھواں پینے لگے۔ چوری کے اس پیگ کو بھرنے اور حلق میں انڈیلنے کے لئے جتنی پھرتی سے انھوں نے کام لیا اتنی ہی تیزی کے ساتھ اُن کا تمام غم و غصہ ایک ساتھ دُھل گیا۔ اپنے آپ کو ہلکا اور سُبک محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ بیوی کی بیوقوفی پر انھیں ہنسی آ گئی۔

اِدھر کچھ مہینوں سے کہ جب سے ان کے کندھے کپتانی کے تین پھولوں کی بجائے میجری کے چمکدار کراؤن سے مرصع ہو گئے تھے مسز گوتم کو ان کی گرتی ہوئی صحت کا یک لخت الہام ہو گیا تھا۔ انھیں وقت پہ سُلانے، وقت پر جگانے، وقت پہ ناشتہ، لنچ اور ڈنر کرانے کے اہتمام کے علاوہ ان کی روزمرّہ کی شراب نوشی پر پابندی عائد کر کے اس مقصد کے لئے مہینے میں دو دن مقرر کر دیئے تھے۔ بدھ اور سنیچر۔ اور بدھ اور سنیچر کے روز بھی وہ انھیں چوتھے پیگ سے تجاوز نہ کرنے دیتی تھیں۔

شروع شروع میں مسٹر گوتم اس نادر شاہی حکم پہ بہت سیخ پا ہوئے۔ پچھلے آٹھ

برس سے وہ بلا ناغہ شراب پینے کے عادی تھے اور ان کے کہنے کے بموجب ایک شراب ہی کی بدولت چالیس برس کی عمر میں بھی ان کا رنگ کشمیری سیب کی طرح سُرخ تھا اور اُن کے قدم بڑھاپے کی طرف اُٹھنے کے بجائے اُلٹے پڑ رہے تھے۔ مگر ان کا تمام سٹیٹا نا بیکار ثابت ہوا مسز گوتم کے سامنے انھیں ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ یہ بات الگ تھی کہ اب اگر ہر روز نہیں تو ہر دوسرے دن کوئی دوست، کوئی افسر کہ جس کے آگے وہ انکار نہ کر سکتے تھے انھیں مدعو کر لیتا تھا یا کلب اور میس کی محفلوں ہی میں انھیں مجبوراً ایک دو پیگ اُٹھانے پڑ جاتے تھے۔

مسز گوتم جس وقت طشتری میں مچھلی کے ٹکڑے رکھے واپس لوٹیں اور مسٹر گوتم کو صوفے پر اس نیم دراز حالت میں پڑے دیکھا تو انھیں ترس آ گیا۔ "ڈارلنگ! بس یہی کھوٹ ہے تم میں"۔ طشتری کو میز پر ٹکاتے ہوئے وہ ان کی بغل میں بیٹھ گئیں "کیوں اپنی شام خراب کرتے ہو"

اور مسٹر گوتم کا چہرہ ایک جھٹکے کے ساتھ پھر دہک اُٹھا اور پڑے ہی پڑے وہ غرّائے "نہیں تم ہی مجھے مارنے پہ تُلی ہوئی ہو ڈارلنگ۔ تم ہی۔ تم ہی نے ڈیر۔ ان اُلو کے پٹھوں کی کیا مجال ہے"

ایک ادا کے ساتھ اپنے بھاری بھر کم جسم کو سمیٹ کر گلاس میں وسکی انڈیلتے ہوئے مسز گوتم نے اپنے جبڑے کے تمام دانتوں اور مسوڑھوں کی نمائش کر دی "میری خاطر ڈارلنگ! تمھیں میرے سر کی قسم" اور اپنا بازو ان کی گردن کے پیچھے ڈال دیا۔

اور مسٹر گوتم کو بیوی کی حرکتوں سے گھن آنے لگی، انہوں نے بیدلی کے ساتھ چپ چاپ اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور آہستہ آہستہ سپ کرنے لگے۔

بیوی کی اس قسم کی حرکتوں سے انھیں ہمیشہ ہی سے نفرت تھی اور وہ شروع زمانے
ہی سے اسے ایک حد تک اپنے ناقابل سمجھتے آرہے تھے۔ فوج میں بھرتی ہونے سے قبل
بھی جب ان کی شادی نئی نئی ہوئی تھی اور وہ بی۔ اے کر چکنے کے بعد متواتر تین برس
سے بیکار پھر رہے تھے انھیں مسز گوتم، مسز گوتم کہلانے کی مستحق دکھائی نہ دیتی تھیں۔ مسز گوتم
کا وہ تحکمانہ لہجہ۔ ہر بات میں اڑی اور ہر وقت اپنے ماں باپ کے ہی گن گاتے رہنا۔
مسٹر گوتم کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ جس بات سے انھیں چڑ تھی وہ بیوی
کے بیجا نخرے تھے کہ بھینس کی بھینس ہونے کے باوجود وہ خود کو دنیا کی حسین ترین عورتوں
میں شمار کرتی تھی۔ اور ہر وقت اپنے چہرے پر دنیا جہان کے غازے اور پوڈر تھوپے
رہتی تھی۔ والد مرحوم کی فوجی خدمات اور سسر صاحب کی دوڑ دھوپ کے طفیل مسٹر گوتم نے
سکینڈ لیفٹننٹ ہوتے ہی بانگ دہل اعلان کر دیا کہ وہ اس کی ہر جائز و ناجائز برداشت
کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کر یا کندھے سے
کندھا ملا کر اسے سڑکوں یا پارکوں میں گھماتے پھریں اور سنیما تھیٹر یا کسی دوست کے ہاں
لے جائیں اور اگرچہ سکینڈ لیفٹننٹ سے لے کر میجری تک کے دس برسوں میں ان کے
باہمی تعلقات کئی مرحلے طے کر چکے تھے۔ آج مسز گوتم گھر کی تمام سیاہی سفیدی کی مالک
تھیں جسم پہلے سے بھی دوگنا بھدا اور بے ہنگم ہو جانے پر بھی ڈیئر اور ڈارلنگ کہلاتی تھیں
غازے اور پوڈر کا استعمال اب اس بے دریغی سے نہ ہوتا تھا اور ان کی اس چرب زبانی
اس ہٹی طبیعت میں بھی نمایاں فرق آچکا تھا۔ مگر مسٹر گوتم کا وہ فیصلہ آج تک بغیر کسی
تبدیلی کے جوں کا توں چلتا آرہا تھا۔ البتہ کسی وقت خوشی میں آکر جب مسٹر گوتم انھیں "ڈیئر بھینس"
یا "ہاتھی ڈارلنگ" کا لقب عنایت کرتے تو چیں بجبیں ہونے کی بجائے ان کی ڈھلکی ہوئی

چھاتیوں میں زیر و بم پیدا ہو جاتا اور چار بچے جن چکنے کے سبب قدرتی طور پہ بڑھے ہوئے پیٹ میں لہریں سی ناچنے لگتیں اور کھٹ سے جبڑوں سمیت بتیسی نکل آتی۔ تو مسٹر گوتم کو اچانک کلب جانے یکسی پارٹی میں شریک ہونے یا دفتر کے کام کی زیادتی کی بات یاد آجاتی۔

مسٹر گوتم نے مچھلی کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے سے پہلے طشتری کو اٹھا کر سونگھا تو اس میں سے بُو آرہی تھی۔ مگر اس دفعہ نہ جانے کس خیال کے زیر اثر کچھ کہنے کی بجائے انھوں نے مسز گوتم پر اک قہر آلود نگاہ ڈالنے پہ ہی اکتفا کیا اور پھر جو گلاس میں وسکی انڈیلنے لگے تو انڈیلتے ہی چلے گئے۔

مسز گوتم ان کا ہاتھ نہ روک سکیں۔

مسز گوتم اکثر ان کا ہاتھ روکتے روکتے رہ جاتی تھیں۔ انکی لاکھ ہدایتوں اور کوششوں کے باوجود مسٹر گوتم کو کسی نہ کسی چیز میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آہی جاتا تھا اور جب انھیں کوئی نقص نظر آجاتا تھا تو گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی تھی۔ نوکروں کو گالیاں۔ بیوی اور بچوں کو گالیاں۔ دوستوں، واقف کاروں ماتحتوں اور افسروں کو گالیاں۔ اور جب گالیاں بک چکنے کے فوراً بعد یا کہیں درمیان ہی میں وہ ایک دم سنجیدگی اختیار کر لیتے تو مسز گوتم کو ان کا ہاتھ روکنے کی جرأت نہ ہوتی۔ مسٹر گوتم کی چار پیگوں کی قسم ٹوٹ جاتی۔ پیگ بڑے ہو جاتے اور وہ اسوقت تک برابر پیگ پہ پیگ انڈیلتے رہتے جب تک کہ ان کی بوتل دھونے کے لائق نہ رہ جاتی یا انھیں یقین نہ آچکتا کہ انھیں سرور آچکا ہے۔ سرور آچکنے کے بعد انھیں برما کے محاذ اور لنکا کی محفلیں یاد آنے لگتیں۔ دنوں کیچڑ میں دھنسے پڑے رہنا۔ بارہ بارہ گھنٹے کی لگاتار جھڑی سیلاب جونکیں اور مچھر اور دشمن کے بڑے دھانے کی توپوں کے دھماکے۔ ہوائی جہازوں کی

بمباری اور ہر لحظہ شدید سے شدید تر ہوتی ہوئی۔ زندگی اور موت کی کشمکش۔ اور وہ رقص و سرود، ہر رنگ اور ہر نسل کی نازنینوں کے نیم عریاں تھرکتے ہوئے جسم۔ کپتانی کے عہدے کا پُر تمکنت احساس اور شراب، اور وہ یا تو اپنی دونالی میں کارتوس بھر کر بنگلے سے باہر نکل جاتے اور پُرانے قلعے کی جانب جاتی ہوئی سڑک کے اس طرف مرغیوں کے ڈربوں یا نوکروں کے کوارٹروں کی آڑ لے کر اس پہاڑی گیدڑ کا انتظار شروع کر دیتے جو قریبی جنگل سے آکر رات رات بھر ان کے بنگلے کے اردگرد گھوما کرتا تھا اور بالکل انسانوں کی سی آوازیں نکالتا تھا۔ یا پھر وہ اپنی بے تکی آواز میں "کتھاں گجاری آرات ڈھولا" کا پوٹھوہاری گیت اونچے نیچے سروں میں الاپنے لگتے اور مسز گوتم کو ڈیر بھینیس اور ہاتھی ڈارلنگ کے خطاب کے ساتھ ساتھ اُن کے ایک میجر کی بیوی ہونے اور اس طرح کے شاندار بنگلے میں رہنے پر پُر پیچ گالیوں میں تعجب کا اظہار کرتے۔

دلزلی روڈ پر واقع وہ شاندار بنگلہ جس کا پھاٹک مشرق کی طرف کھلتا تھا اور جہاں سے قریبی جنگل اور پُرانے قلعے کے شکستہ میناروں کا نظارہ صاف طور پر کیا جا سکتا تھا انھیں حال ہی میں حکومت کی طرف سے ملا تھا اس سے پیشتر مسٹر گوتم فوجی میس میں رہتے تھے اور مسز گوتم بمعہ اپنے چاروں بچوں اور دونوں نوکروں کے پُرانی دلّی کی ایک گنجان آباد گلی میں۔ پاکستان بننے سے پیشتر اور جنگ کے دوران میں چونکہ مسٹر گوتم کو اکثر ملک کے دور دراز علاقوں میں رہنا ہوتا تھا مسز گوتم لاہور میں اپنے والدین کے ہاں رہتی تھیں۔ نسبت روڈ پر واقع اس چھوٹے سے مکان میں ہر وقت ایک ہنگامہ، ایک طوفانِ بدتمیزی سا برپا رہتا تھا اور مسز گوتم اُنس کی حد تک اس ہڑبونگ کی عادی ہو چکی تھیں۔ بچے چیخ چلّا رہے ہیں لیکن نوکروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کھونٹیوں کے کپڑے، کونوں کتروں میں، ٹوٹے ہوئے

ریکٹ اور بلے ڈریسنگ ٹیبل پہ۔ صابن دانیاں اور تیل کی شیشیاں رسوئی گھر میں اور گیلے تولئے اور دانتوں کے برش ڈرائنگ روم میں۔ مگر یہاں آکر ایک دُنیا بدلنی تھی۔ بچوں کو ایک میجر کے بچے اور بیوی کو ایک میجر کی بیوی بننا تھا۔ مالی سے بھنگی اور بھنگی سے خانساماں کا کام نہیں لینا تھا اور مسٹر گوتم کو کہ ایک دُنیا دیکھ چکے تھے اور فوجی تربیت کے کارن ہر حرکت، ہر فعل میں سلیقہ اور باقاعدگی دیکھنے کے متمنی تھے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی سارا بنگلہ سر پہ اُٹھا لینے کی ضرورت محسوس ہو جاتی اور پھر شراب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پیگ کو ہاتھ میں لیکر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑکی کا پردہ اُٹھا کر باہر تاریکی میں گھورنے لگے۔ جنگل سے آنے والی سرد ہوا کے جھونکوں نے ان کی کنپٹیوں کو سہلانا شروع کر دیا اور جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ ان کا سرور کس ڈگری تک پہنچ چکا ہے۔ ہاتھ کے پیگ کو ختم کر چکنے کے بعد وہ دوبارہ آکر صوفے میں دھنس گئے اور مسز گوتم کے کچن میں چکر لگانے کی غرض سے اُٹھ جانے کے سبب منہ بگاڑ بگاڑ کر جھلسے ہوئے انڈے اور بری بھسی مچھلی نگلنے لگے۔ اچانک انھیں پچھلے اتوار کو مسز بھاردواج کے ہاں کھائے ہوئے انڈوں کے حلوے کی یاد آگئی۔

مسز بھاردواج ان کے ماتحت کیپٹن رلیارام بھاردواج کی بیوی تھیں وہ جب سے دلی میں تعینات ہوئے تھے اور جب سے مسٹر بھاردواج کو ان کی شراب پرستی، ان کی رنگیلی طبیعت کا علم ہوا تھا وہ لوگ ہر اتوار کو اپنے ہاں ہونے والی سنڈے سٹنگ میں انھیں ضرور مدعو کرتے تھے۔ محفل میں مسٹر اور مسز بھاردواج کی دونوں نوجوان لڑکیوں کے علاوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری اعلیٰ گھرانوں کی عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ وہاں کسی قسم کے تکلف کی گنجائش نہ تھی۔ دوستوں کی طرح اکٹھے مل بیٹھنا ہنسی مذاق کھانا پینا ہوتا تھا

سیر و تفریح کے پروگرام بنتے تھے اور سارا دن ہنستے کھیلتے گذر جاتا تھا اور یہ ان سب پارٹیوں ہی کا صدقہ تھا کہ مسٹر گوتم کو مُیس کی آزادانہ زندگی ہفتے میں ایک آدھ بار ہی یاد آتی تھی۔ مسٹر گوتم سے بارہا وہ لوگ مسز گوتم کو ہمراہ لانے کے لئے کہہ چکے تھے مگر وہ ہر بار ٹال مٹول کر جاتے۔ کوئی بہانہ تراشتے وقت انھیں کتنی کوفت ہوتی تھی۔ نازک اندام اور ہنس مکھ نازنینوں کے درمیان ایک بھاری بھرکم جسم کی بدشکل اور بے ہنگم اور محفلوں کے آداب سے قطعاً بے بہرہ عورت کے تصوّر ہی سے ان کا دل کباب ہو جاتا۔ رمی یا برج کھیلتے وقت جب دستور کے مطابق اپنی بیوی کو مخالف سمت میں بٹھانے کی بات اٹھتی اور مسز بھاردواج کی دونوں نوجوان اور چلبلی لڑکیاں ان کے گھٹنوں پر بیٹھ کر اور ان کی گردن میں بازو حمائل کر کے مسز گوتم مسز گوتم کا شور مچانے لگتیں تو فرطِ رنج سے وہ ڈوبے جاتے اور کھیلنا، بات کرنا ایک بار ہو جاتا اور وہ رات نوکروں اور بچوں اور مسز گوتم کی شامت کی رات ہوتی۔

بیوی کی بدصورتی کو تو وہ کسی طرح نظر انداز کر سکتے تھے بلکہ اُس کی بدصورتی کی آڑ لیکر تو لوگوں کی نگاہوں میں وہ خود کو زیادہ قابلِ رحم انسان منوا سکتے تھے۔ مگر اونچے درجے کے لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کی صلاحیت کا جو اس میں فقدان تھا اسے کسی صورت بھی قابلِ معافی نہ سمجھا جا سکتا تھا۔ اگر ایک بار بھی اُسے اس قسم کی کسی محفل میں شریک کر لیا گیا، مسٹر گوتم کا خیال تھا کہ وہ برسوں سے چلے آرہے کسی بریکار خاوند کی بیوی ہونے ہی کے اہل تھی، تو انھیں عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ اتنی سی بات پہ ہی وہ ان کے بیگانی عورتوں کے ساتھ ناجائز راہ و رسم کا ڈھنڈورہ پیٹ دیگی اور کچھ تعجب نہیں جو اپنا سر بھی پیٹ لے۔ اس کے سر پیٹ لینے کا تو انھیں تلخ تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ ان دنوں وہ سیلون سے چھٹی پہ آئے تھے

اور انھوں نے بڑی تفصیل تذکرہ اپنی وہاں کی زندگی کے متعلق صرف اتنا کہہ دیا تھا کہ اگر انھیں ٹکوں مینیادوں وغیرہ میں جانے کی اجازت نہ ہوتی اور نہ ہی میڈم بوئی ایسی مہمان نواز عورت سے اُن کا واسطہ پڑتا تو بھلے چنگے آدمی کو بیمار اور کمزور کر دینے والی وہاں کی آب و ہوا اور خوراک اُن کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی۔ میڈم بوئی سے ان کا صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ انھیں اپنے مرحوم خاوند میجر بوئی کی باتیں، اس کے کارنامے بڑے چاؤ سے سنایا کرتی تھی۔ اور انھیں وقت بے وقت اپنے گھر آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اپنے کمسن لڑکے سے وہ انھیں فوجی سلام کرواتی۔ انھیں فلاں چیز کافی مقدار میں کھائیے، فلاں کو سونگھنے تک کی کوشش نہ کیجیے وغیرہ ہدایات دیا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھار شاپنگ یا چہل قدمی کرنے ان کے ساتھ نکل جاتی تھی مگر مسز گوتم پر کچھ یہ حقیقت نزول ہوگئی کہ میڈم بوئی کے ساتھ ان کے میاں بیوی کے تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ ساری رجمنٹ اس بات کی شاہد ہے اور یہ کہ کچھ ہی دنوں بعد وہ بدکار عورت ان کا نام کٹوا کر انھیں لندن لے اُڑیگی اور اس بات پہ خاندان بھر میں، وہ لے دے ہوئی کہ چھٹیاں ختم ہونے سے قبل ہی انہوں نے واپسی کا ٹکٹ کٹوا لیا اور لگاتار دو مہینے تک مسز صاحب کی طرف سے ہر تیسرے چوتھے آدھمکنے والے خط کو بغیر پڑھے ہی پھاڑتے رہے۔

مسز گوتم ابھی تک کچن سے واپس نہ لوٹی تھیں اور ساتھ کے بیڈ نگ روم میں ننھے وجے نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا تھا۔ مسٹر گوتم برداشت نہ کر سکے۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گھر میں آیا رکھنے پہ وہ بارہا زور دے چکے تھے۔ مگر مسز گوتم تھیں کہ ان کی ایک نہ سُننی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ چاہے مسٹر گوتم کو کمانڈر انچیف ہی کا عہدہ کیوں نہ مل جائے۔ بچوں کو وہ کسی دوسری عورت کے رحم پہ نہیں چھوڑ سکتیں۔ "ڈارلنگ کہاں

جا کر مر گئی ہو۔" مسٹر گوتم آپے سے باہر ہو گئے۔" ان حرامخوروں میں سے ہی کسی کو بھیج دو۔"
لیکن جا کر مر رہنے والی یا کسی حرامخور کی آمد سے قبل ہی وہ خود لڑکھڑاتے ہوئے بیڈ روم
میں جا پہنچے اور وجے کو تھپتھپانے لگے۔ سُلانے کے ہوائی بوسوں اور گالیوں کے ساتھ ساتھ
وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سادھو بن جانے کا دردبھی کرنے لگے۔

مسز گوتم نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اطلاع دی کہ کھانا چُنا جا چکا ہے اور ٹھنڈا
ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ پھر سے کچن یا ڈائینگ روم کا ملاحظہ کرنے چلی جائیں
مسٹر گوتم نے ایک فوجی کڑاک اور ایک بہت ہی موٹی گالی کے ساتھ انھیں حواس باختہ کر دیا۔

"ڈارلنگ کچھ ہوش کرو" مسز گوتم منمنائیں۔" بچے جاگ اُٹھیں گے۔" اور بڑھکر
ان کا بازو تھامتی ہوئیں لیکن انھیں اُٹھانے سے زیادہ ان پہ گرتی ہوئیں اپنی مخصوص
ہنسی کے ساتھ پھر چہکیں۔" چلو اٹھو۔ کھانا کھا لو۔"

اور میجر اے۔ وی نروتم داس گوتم ایک سعادتمند بچے کی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے۔

تحریک
جنوری ۱۹۷۹ء

شوکت صدیقی

تانتیا

کرفیو آرڈر کی رات تھی۔ پت جھڑ کی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں اور ویران جگہوں میں کتّے رو رہے تھے۔ کیسا نووا ہوٹل پُر اسرار خاموشی میں اونگھتا ہوا نظر آ رہا تھا، رقص گاہ کے ہنگامے سرد تھے، جام منہ اوندھائے پڑے تھے۔ باورچی خانہ کی چمنی سے ابھرنے والے مرغولوں کا کہیں سُراغ نہیں مل رہا تھا۔ باہر گلی میں کھلنے والی کھڑکی بند پڑی تھی اور تانتیا دیواروں کے گہرے سائے میں بیٹھا ہوا تھا۔

جب بازاروں کی چہل پہل اُجڑ جاتی اور رات گہری ہو جاتی تو تانتیا اس تنگ گلی میں چلا آتا۔ دھوئیں میں اُلجھی ہوئی باورچی خانے کی پھیکی روشنی کو دیکھتا اور کھڑکی پر اُبھرنے والے انسانی سائے کا انتظار کرتا۔ لیکن جب دیر تک کوئی نظر نہ آتا تو وہ جھنجھلا کر چلّانے لگتا: "ابے! کیا اپنے باپ کو بھول گئے سالو! یہ انتظاری کب تک ہو گی؟" اندر باورچی خانے میں بیرے ٹھٹھا مار کر ہنستے خانساماں گردن نکال کر کہتا "ارے مرا کیوں جا رہا ہے۔ کوئی میز تو خالی ہونے دے۔" اور تانتیا مطمئن ہونے کے انداز میں جھوم کر نعرہ لگاتا "واہ کیا بات ہے تیری

جیو میرے راجہ" بوڑھے خانساماں کو راجہ کہلوانے کا ارمان تھا۔ یا پھر کوئی جذبۂ
ہمدردی، یا محض احساس برتری اور یہ ارمان تھا، یا ہمدردی یا احساس برتری کہ
خانساماں کو برابر یہ خیال ستاتا رہتا تھا کہ باہر اندھیرے میں تانتیا بیٹھا ہوا ہے بھوک
بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے الجھے ہوئے مٹیالے بال اوس میں بھیگتے جا رہے ہیں
اس کی بھوکی آنکھیں کھڑکی کی طرف لگی ہیں۔ وہ ولایتی شراب کی تیز مہک پہ جان
دیتا ہے اور اس کی تلخی اسے مرغوب ہے۔ خان ساماں اپنے کام میں الجھا رہتا
بیرے مستعدی سے آکر آرڈر پہ آرڈر سناتے۔ اور خان ساماں کو تانتیا کا خیال
ستاتا رہتا۔ رقص گاہ میں قہقہے لگتے رہتے۔ جام ٹکراتے رہتے۔ آرکسٹرا کے نغمے
تھرتھراتے رہتے۔ پھر کوئی میز خالی ہوتی۔ پھر کوئی بیرا بچی کھچی غذائیں لے کر آتا۔
بچی ہوئی شراب لے کر آتا۔ اور خانساماں بچی کھچی غذاؤں پہ شراب چھڑک دیتا
اور کھڑکی پہ جاکر کھڑا ہو جاتا۔ تانتیا اس کو دیکھتے ہی بے تابی سے جھپٹتا۔ لیکن
خانساماں پیچھے ہٹ کر تانتیا کی بے صبری سے لطف اٹھانے لگتا۔ "سالے!
اتنی جلدی، بیٹا اصلی شراب پڑی ہے یوں تھوڑی ملے گی!" تانتیا کی گرسنہ
آنکھیں جھپکنے لگتیں، ہونٹ پھڑپھڑانے لگتے اور بکھری ہوئی مونچھیں دانتوں
سے الجھنے لگتیں، وہ خوشامد کرنے لگتا "ارے کیوں جلا رہے ہو۔ پیٹ میں آگ
لگی ہوئی ہے!" پھر خان ساماں کو جلد ہی بیروں کے سنائے ہوئے آرڈر یاد آجاتے
مینیجر کی ڈانٹیں یاد آجاتیں۔ اور وہ ٹرے کو تانتیا کے دامن میں الٹ دیتا۔
تانتیا خالص فوجی انداز میں اس کو سلیوٹ کرتا۔ مزے لے لے کر ہر چیز کو کھاتا
پاس کھڑے ہوئے کتوں کو دھتکارتا اور خان ساماں کو زور زور سے گالیاں دیتا

اور خان ساماں بیوقوفوں کی طرح ہنستا رہتا۔ شاید اسے گالیوں کا بھی ارمان تھا۔
لیکن کھڑکی بند تھی۔ تانتیا چلایا بھی، خوشامد بھی کی اور گالیاں بھی دیں۔ اور بوڑھے خان ساماں کو نہ راجہ کہلوانے کا ارمان پیدا ہوا، نہ رگِ ہمدردی پھڑکی نہ احساس برتری نے ستایا اور نہ گالیوں سے اسے ہنسی آئی۔ چند گھبرائے ہوئے بیروں کے ساتھ وہ بھی باورچی خانے میں سہما ہوا بیٹھا رہا اور کھڑکی کھل نہ سکی۔
تانتیا نے مایوس ہوکر فرش پہ اندھیرے میں ٹٹولنا شروع کر دیا۔ سوکھے ہوئے کچھ توسٹوں کے ٹکڑے اسے مل گئے اور اس نے منہ میں بھر کر انھیں چبانا شروع کر دیا۔ باسی مکھن کے کھٹے پن پہ اسے شراب کی تلخی یاد آرہی تھی۔ اور اس کے نزدیک ہی ایک مریل سا کتا مزے سے ہڈی چچوڑ رہا تھا۔ تانتیا کو اس کے اس طرح ہڈی چچوڑنے پر الجھن ہونے لگی اور اس نے جل کر اس کے ایک لات جما دی "یہاں تو بیٹھے ترس رہے ہیں اور یہ سالے موج اڑا رہے ہیں"۔ کتا چیختا ہوا بھاگا اور اس کی چیخیں فلک بوس عمارتوں سے ٹکرا کر گلی کی گہرائیوں میں گونجنے لگیں۔ گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں ایکبارگی کئی کانسٹبلوں کے سائے ابھر آئے۔ کسی نے چیخ کر پوچھا "کون ہے؟" پھر ٹارچ کی تیز روشنی تانتیا کے جسم پہ لہرانے لگی۔ وہ بدحواس ہوکر دوسری سمت بھاگا اور بندوق کی دھڑ دھڑاتی ہوئی آواز پُراسرار خاموشی میں ابھری۔ گولی تانتیا کے پیر کے پاس سے چھیلتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دیواروں کے اندھیرے میں دبکتا ہوا اس سڑک پہ آ گیا۔ جو کشادہ بھی تھی اور روشن بھی۔ اور وہ ایک کوٹھی کے برآمدے میں گھس گیا۔ سب دروازے بند تھے مگر کونے والے کمرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی وہ اس پہ چڑھ کر اندر پھاند گیا

اور جھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔

اور جب کھڑکھڑاتے ہوئے جوتوں کی بھاری آوازیں دُور ہو گئیں اور سڑک پر سنّاٹا چھا گیا تو وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا روشن دان سے روشنی کی ہلکی ہلکی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ دیوار کے پاس ایک لمبی میز پڑی ہوئی تھی، اس پر کچھ کتابیں بکھری ہوئی تھیں، کچھ کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ اور سگریٹ کا ایک ٹین بھی نظر آرہا تھا۔ تانتیا اسے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ کمرے میں کوئی موجود نہیں۔ کوٹھی کے دوسرے حصّے میں نہ کوئی آہٹ تھی اور نہ کوئی آواز۔ اور خاموشی بہت گہری تھی اور وہ میز کے پاس چلا گیا۔ سگریٹ کا ٹین اٹھا کر کھولا۔ صرف ایک سگریٹ نکالی اور ٹین کو پھر اُسی طرح رکھ دیا۔ مگر اس نے سگریٹ سلگائی نہیں بلکہ برابر والے کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں جھانکنے لگا۔ یہاں بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا اور وہ اس میں چلا گیا۔ اس کمرے میں بھی دھندلی سی روشنی تھی۔ فرش پر پرانے اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار کے پاس دو خالی پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ سامنے کھونٹی پر ایک پُرانا گاؤن لٹک رہا تھا۔ تانتیا نے اُسے چھو کر دیکھا۔ گاؤن اُونی کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ اور تانتیا کو سردی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اُس نے گاؤن کو پہن لیا اور ٹہلتا ہوا دوسرے کمرے میں اس طرح چلا گیا، جیسے خواب میں چل رہا ہو، اس کمرے میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ اور اُس نے پکارنا شروع کر دیا۔

"ارے کوئی ہے یہاں؟"

"کوئی ہے یہاں؟"

"کوئی ہے یہاں ؟ ؟ "

اور تینوں مرتبہ اس کی آواز خاموش دیواروں سے ٹکرا کر شکست ہوگئی اور وہ ایک نرم سے صوفے پر خالی الذہن سا جا کر نیم دراز ہوگیا۔ اس عرصہ میں پہلی بار اُسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا ہے۔ اسے کھانے سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ اور وہ خوابیدہ نظروں سے آتشدان پر رکھے ہوئے دھات کے یونانی مجسّمے کو دیکھنے لگا اور یہ مجسّمہ اس کو اپنی طرح تنہا اور اونگھتا ہوا معلوم ہوا۔

وہ اٹھ کر آتش دان کے پاس گیا۔ مجسمے کو اُٹھایا اور پھر گھبرا گیا جیسے وہ کوئی پُراسرار طاقت تھی جو دھات میں سمٹ کر منجمد ہوگئی تھی جیسے وہ صدیوں کا بھٹکا ہوا کوئی راہی تھا جو نڈھال ہو کر ٹھہر گیا تھا تانتیا نے سہمی ہوئی نظروں سے ہر طرف دیکھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی، دیواروں کا گہرا سبز رنگ بڑا خواب ناک معلوم ہو رہا تھا۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ کوئی آواز۔ اور تانتیا کا کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ اور وہ دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا اور اندھیرا بھی چھایا ہوا تھا۔ باہر کی روشنی کو دروازے پر لہراتے ہوئے پردے نے روک رکھا تھا۔ تانتیا نے اندھیرے سے وحشت زدہ ہو کر پردے پر ہاتھ مارا اور اُسے نوچ کر فرش پر پھینک دیا۔ روشنی ایک بار کمرے میں گھُس کر بکھر گئی اور تانتیا مسکرانے لگا۔ اس کمرے میں کوئی پلنگ نہ تھا۔ فرش بہت ٹھنڈا تھا۔ تانتیا کے برہنہ پیروں کے تلوے سنسنانے لگے دیوار سے لگی ہوئی دو الماریاں کھڑی تھیں۔ اس نے ایک کو کھولا۔ اندر کچھ میلے

کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے جھنجھلا کر ان کو باہر پھینک دیا۔ پھر الماری کو اطمینان بخش نظروں سے دیکھنے لگا کہ اب اس کو سردی نہیں لگے گی۔ اب اس کو آرام مل جائے گا۔ اور وہ اس میں سو سکے گا۔ اور جیسے یہ الماری اس کی ہے۔ یہ کمرہ اس کا ہے۔ اور اس کا جی چاہا کہ ایک بار پھر سب کمروں میں جائے۔ اس نے الماری بند کر دی اور اس میں لگا ہوا آئینہ اُس کے سامنے آگیا۔ اس نے اپنے عکس کو دیکھا۔ اُلجھے ہوئے مٹیالے بال۔ بکھری ہوئی گھنی مونچھیں۔ گندی سی بے ترتیب داڑھی۔ اور اس دھندلے چہرے پہ چھائی ہوئی وحشت۔ اس نے خود کو پہچان کر پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اور دھات کے یونانی مجسمے کو کھینچ کر آئینے پہ دے مارا۔ آئینہ جھنجھنا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور الماری کے پیچھے سے ایک کم سن سی لڑکی چیخ کر باہر آگئی۔

تانتیا نے خوف زدہ ہو کر کہا "کون ہے ری تو؟"

لڑکی کہنے لگی "میں نمو ہوں!"

اور تانتیا کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ بلکہ اُسے خود پہ غصّہ آنے لگا۔ کہ وہ اس کمزور لڑکی سے کیوں ڈر گیا۔ اور پھر وہ اس پہ جھنجھلا اُٹھا۔ "حرامزادی تو یہاں کیا کر رہی تھی" لڑکی اب بھی سہمی ہوئی تھی۔

"میں تو ڈر کر یہاں چھپ گئی تھی"

تانتیا پوچھنے لگا "تو یہاں اکیلی ہی ہے۔ اور کوئی نہیں؟"

لڑکی بتانے لگی "ڈاکٹر ساب شام ہی کو چلے گئے۔ میں نے کہا مجھے بھی اپنے ساتھ موٹر میں بیٹھے چلو لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ اور مجھے اپنے ساتھ

نے بھی کیسے جاتے، ہوائی جہاز میں دو ہی آدمیوں کی تو جگہ تھی؟" اور یہ بتاتے بتاتے لڑکی کے چہرے پر بچپن کی سی معصومیت چھا گئی" وہ بھی چلے گئے، بی بی جی کو بھی لیتے گئے اور بے بی کو بھی لے گئے" لڑکی کچھ اداس ہو گئی۔

تانتیا نے یونہی پوچھ لیا" یہ بے بی کون؟"

لڑکی کا چہرہ ایکبارگی نکھر گیا۔ اداسی کا غبار جیسے چھٹ گیا۔ چہک کر بولی "ان کا ننھا۔ بہت بھولا بھالا تھا۔ بڑا پیارا سا۔ بالکل ربڑ کا سا لگتا تھا۔ آؤ تم کو بھی دکھادوں" اور وہ باہر والے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ تانتیا خاموشی سے اسکے ساتھ ہو لیا۔ لڑکی نے دیوار سے ٹنگی ہوئی ایک خوبصورت سے بچے کی تصویر دکھائی جو سامنے لڑھکتی ہوئی گیند کے پیچھے بھاگ رہا تھا، اس کے چہرے پر ہنسی تھی اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ لڑکی کہنے لگی" دیکھو کتنا پیارا ہے" اور تانتیا سوچنے لگا کہ بچہ گیند پر لپک رہا ہے اور یہ گیند نہیں نمو ہے۔ اور نمو جو اس کو اب نہیں مل سکتی۔ نمو جو اس کے لئے اداس ہے۔ لیکن بچہ ہنس رہا ہے۔ وہ کیوں اداس ہو۔ اس کو کوئی اور نمو مل جائے گی، اور تانتیا نے جھٹ سے دیوار سے تصویر کھینچی اور فرش پر پٹک دی۔

لڑکی خوفزدہ ہو کر بولی" یہ کیا کیا تم نے؟"

تانتیا کہنے لگا" سالی تو تو بالکل الو کی پٹھی ہے۔ یہ بھی تو اسی سالے ڈاکٹر کا بیٹا ہے جو تجھ کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر چلا گیا" اور لڑکی کی سمجھ میں گویا کچھ نہیں آیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی تصویر کو اٹھایا اور اسے دیکھنے لگی۔ اور تانتیا سوچنے لگا کہ یہ لڑکی بالکل الو کی پٹھی ہے اور اس کا اپنا جسم سردی سے تھر تھرا رہا ہے۔ اور اس کے پیر کے

ناسور میں بڑی ٹیس ہو رہی ہے اور وہ لڑکی سے کہنے لگا" ارے لڑکی ذرا کڑوا تیل لے آ۔ میں اپنے پیر کے زخم میں ملوں گا" لڑکی اس کے قریب آ گئی۔

"کیا ہوا تمہارے پیر میں؟"

اور تانتیا نے اسے بتایا" ناسور ہو گیا ہے"

لڑکی اس کے جسم سے دلچسپی لینے لگی" تو اس کا علاج کیوں نہیں کرواتے؟"

تانتیا کہنے لگا" بہت تو علاج کروایا۔ ہسپتال میں بھرتی ہو گیا۔ پر یہ ڈاکٹر سالے ہوتے ہی بدمعاش ہیں۔ سالوں نے علاج تو کچھ کیا نہیں۔ بلکہ کہنے لگے کہ تم اپنا پیر گھٹنے پر سے کٹوا دو۔ نہیں تو ساری ٹانگ سڑ جائے گی۔ پر میں بھی ایک ہی سیانا نکلا۔ بس جس روز انھوں نے آپریشن کا انتظام کیا۔ میں رات ہی کو وارڈ کی کھڑکی پھاند کر بھاگ آیا پھر کسی سالے کے پاس نہیں گیا۔ اپنا تو کڑوے تیل ہی سے کام چل جاتا ہے"

اور نمو نے جھٹ سے شلوار چڑھا کر اپنی پنڈلی دکھا دی۔ دیکھو یہ کتنا بڑا نشان ہے۔ میرا تو اتنا بڑا زخم ڈاکٹر صاحب نے اچھا کر دیا اور تانتیا سوچنے لگا کہ اس کا اپنا پیر بڑا گھناؤنا ہے۔ اس پر چیتھڑے لپٹے ہوئے ہیں۔ ناسور سے پانی بہہ رہا ہے۔ اور نمو کی پنڈلی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے چہرے پر کنواریوں کا اچھوتا پن ہے۔ نرمی ہے، جوانی کی پھوٹتی ہوئی شادابی ہے۔ اور پھر نمو، نمو نہ رہی۔ صرف ایک لڑکی ایک عورت رہ گئی۔ اور تانتیا سوچتا رہا کہ اس گھر میں سب کچھ اس کا ہے۔ یہ خوبصورت کمرہ بھی، یہ نرم نرم صوفہ بھی، یہ لہراتے ہوئے پردے بھی، اور یہ نکھری ہوئی سبز دیواریں بھی۔ اور یہ نمو، صرف ایک لڑکی، ایک عورت، اور عورت کو اس نے کبھی اتنے قریب محسوس نہیں کیا تھا۔

نمو نے تانتیا کو دیکھا۔ اس کے چہرے کی وحشت کو دیکھا اور گندی سی آنکھوں کا وہ انداز کہ وہ شرما بھی گئی اور گھبرا بھی گئی۔ اس نے جھٹ سے اپنی پنڈلی چھپا لی۔ تانتیا ایکبارگی جھنجھلا اٹھا۔ نمو کی طرف بڑھا اور وہ خوفزدہ سی پیچھے ہٹنے لگی۔ تانتیا کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی اور اس نے نمو کو بے ڈھنگے پن سے دبوچ لیا۔ اس کے لباس کو تار تار کر ڈالا۔ اس کے ہونٹوں کو چبا ڈالا، اس کے رخساروں کو چبا ڈالا۔ اور پھر اس کی نرم چھاتیوں کو، اس کی گداز بانہوں کو اور اس کے تمام جسم کو دانتوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ نمو خوفزدہ سی اس کو دیکھتی رہی۔ پھر چیخنے لگی۔ پھر بے ہوش ہو گئی۔

نمو کا برہنہ جسم فرش پر پڑا رہا۔ اس کے جسم پر دانتوں کے نشان تھے۔ رخسار نیلے پڑ گئے تھے اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ باہر زمستانی ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ پھر تانتیا نے نمو کے برہنہ جسم پر پُرانا گاؤن ڈال دیا اور فرش پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

تانتیا بیٹھا ہوا چُپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ دھوئیں کے پیچ وخم لہراتے رہے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایکا ایکی کوٹھی کے پچھلے حصے پر ملی جُلی انسانی آوازوں کا دبا دبا شور ابھرنے لگا اور تانتیا بیٹھا ہوا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا اور شور بڑھتے بڑھتے قریب آ گیا۔ پھر دیوار پر سے پھاندنے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ پھر کوٹھی کے صحن میں قدموں کی پُراسرار آہٹیں گونجنے لگیں، پھر کچھ لوگ کمرے کا دروازہ کھول کر کمرے کے اندر آ گئے۔ تانتیا نے ان کو دیکھا، اور خاموشی سے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ جیسے وہ ان کو اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا جیسے وہ ان کو ہمیشہ سے جانتا تھا۔

پھر ان میں سے کسی نے پوچھا "ابے تو کون ہے؟"

"تانتیا!"

اور تانتیا ان کی طرف اس طرح دیکھنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ پھر انھوں نے جیسے اسے پہچان لیا۔ اور وہ ہنسنے لگے۔ پھر انھوں نے نمّو کے متعلق پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

تانتیا نے کہا "لڑکی!!" اور وہ مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز بھی تھا اور بے باکی بھی۔

وہ نمّو کے جسم کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے گاؤن کو ہٹا دیا اور حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا "ارے یہ تو بالکل ننگی ہے" اور سب جھک کر دیکھنے لگے۔

وہ جھکے ہوئے بے چین نظروں سے اسے دیکھتے رہے!

پھر کسی نے ان میں سے کہا "ارے یہ تو مر گئی۔ کیا دیکھ رہے ہو اس کو" اور سب علیحدہ ہو کر بکھر گئے۔ نمّو کے جسم پر گاؤن ڈال دیا گیا اور وہ تجسس انگیز نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگے۔ پھر کوئی بول اٹھا "ڈاکٹر سالا سب کچھ لے گیا۔ اب یہاں کیا دھرا ہے" اور وہ تانتیا کی طرف دیکھنے لگے۔

"ابے تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ سالے کیا تو بھی جل کے مرجانا چاہتا ہے"

اور ایک آدمی نے بڑھ کر تانتیا کو دروازے کی طرف ڈھکیل دیا "چل بھاگ یہاں سے" تانتیا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا "تو مار کیوں رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے۔ میں کوئی یہاں بیٹھا رہوں گا"

اور تانتیا کوٹھی سے نکل کر باہر آگیا۔

سڑک پر آکر تانتیا نے محسوس کیا کہ سڑک وہی ہے۔ جھلملاتی ہوئی روشنیاں وہی ہیں۔ اور سامنے ڈاکٹر کی کوٹھی وہی ہے۔ اور یہ کوٹھی اس کی نہیں ہو سکتی۔ کمرہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ نرم نرم صوفہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ لہراتے ہوئے پردے اس کے نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف تانتیا ہے۔ گاؤن اُس نے نموّ کو اڑھا دیا تھا۔ دھات کا یونانی مجسمہ اُس نے پھینک دیا تھا۔ اور سگریٹ ختم ہو چکی تھی۔ پھر ڈاکٹر کی کوٹھی میں سے دُھواں نکلنے لگا، شعلے اُبھرنے لگے اور دروازے چیخ چیخ کر شور مچانے لگے۔ پھر کوٹھی کے اندر نموّ کی گھٹی ہوئی چیخیں سُنائی دینے لگیں اور تانتیا کوٹھی کی طرف پلٹ پڑا نموّ ابھی زندہ تھی اور نموّ ابھی اُسے چاہیئے بھی تھی۔

تانتیا شعلوں سے الجھتا ہوا کوٹھی میں گھُس گیا۔ پھر نموّ کے پاس چلا گیا۔ نموّ اس کو دیکھتے ہی اس سے چمٹ گئی اور وہ اسے لے کر باہر نکلنے لگا۔ اس کے چاروں طرف گہرا مٹیالا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ شعلے بھڑک رہے تھے، لکڑیاں چٹخ چٹخ کر گرتیں تو چنگاریاں دور تک بکھر جاتیں۔ اور شعلوں سے لپٹتا ہوا، دھوئیں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا وہ باہر آگیا۔ اُس کا چہرہ جھلس گیا تھا۔ داڑھی جل کر اور بھی خوفناک ہو گئی تھی۔ نموّ نے آنکھ کھول کر دیکھا اور تانتیا کہانیوں کے آسیبی بھوتوں کی طرح اس کو بھیانک معلوم ہوا۔ اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور تانتیا اس کو لئے ہوئے فٹ پاتھ پر دیواروں کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

تانتیا دیواروں کے سائے میں چلتا رہا۔ چہرے پر جلن ہوتی رہی، اور نموّ بازوؤں سے چمٹی رہی۔ پھر ایک پولیس لاری اس کے پاس آکر رُک گئی۔ کچھ

کانسٹبل اُتر کر نیچے آئے اور اس کو ٹھہرا لیا۔

"کہاں سے آ رہا ہے؟"

اور تانتیا نے نمّو کو سامنے کر دیا" میں تو اس لڑکی کو آگ سے نکال کر لا رہا ہوں" اور انھوں نے گاؤن اُٹھا کر دیکھا۔ نمّو خوفزدہ نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ تانتیا نے جھٹ سے ہاتھ ہٹا دیا" اسے اس کو نہ کھولو، یہ بالکل ننگی ہے" اور وہ ہنسنے لگے۔

"تو سالے اس کو لئے کہاں جا رہا ہے؟"

تانتیا نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟"

وہ بے باکی سے ہنسنے لگے "ابے! اس کو کھڑا تو کر"

تانتیا نے نمّو کو فٹ پاتھ پر کھڑا کر دیا۔ نمّو بالکل چپ تھی۔ تانتیا بھی چُپ تھا۔ اور وہ سب اس کو دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف کر لیا" یہ ہمارے ساتھ لاری میں جائے گی۔ یہ رفیوجیز کیمپ میں رہے گی" اور وہ نمّو کو لے کر لاری کی طرف چلنے لگے۔ نمّو اب بھی خاموش تھی۔

تانتیا کہتا ہی رہا" یہ میرے پاس رہے گی۔ میں نے اس کو آگ سے بچایا ہے اسے میرے پاس رہنا چاہئے" اور کانسٹبل نمّو کو لے کر لاری میں بیٹھ گئے۔ لاری آگے چل دی۔ اور تانتیا لاری کو خوابناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ لاری دُور ہوتی گئی۔ نمّو جس کا جسم لہراتے ہوئے پردوں کی طرح نرم تھا جس کے چہرے پر کنوار پن کا اچھوتا پن تھا۔ نرمی تھی اور جوانی کی پھوٹتی ہوئی شادابی تھی۔ نمّو صرف ایک لڑکی ایک عورت، جسے اُس نے اپنے قریب محسوس کیا تھا، جسے اُس نے چھو کر دیکھا تھا

اور لاری اندھیروں میں اوجھل ہو گئی۔ اور تانتیا نے غصے سے فرش پر تھوک دیا
پھر وہ سڑک پر چلنے لگا۔

تانتیا سڑک پر جھکا ہوا سا چلتا رہا۔ مگر وہ جاتا بھی کہاں۔ سامنے مکان جل رہے تھے شعلے لہرا رہے تھے۔ دھوئیں کے مرغولے بلندیوں پر بکھرتے جا رہے تھے اور اُبھرتی ہوئی انسانی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔ وہ آگے نہ گیا اور ایک نیم کشادہ سڑک پہ مڑ کر ایک تنگ سی بدرو میں گھس گیا۔ یہاں اندھیرا بھی تھا اور کیچڑ بھی ...... اور بڑی تیز بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ماچس جلا کر دیکھا کہ وہ کیچڑ میں جھکا ہوا کھڑا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک برہنہ لاش پڑی ہوئی ہے۔ لاش پھول کر اکڑ گئی تھی۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں ہیبت سے کھنچی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ دیکھو مجھے کیسی بے بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔ مجھے انتقام لینا چاہئے تھا اور وہ وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف جہاں زمین خشک تھی اس پر بیٹھ گیا۔

وہ اندھیرے میں بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ اس کے چاروں طرف تاریکی ہے، کیچڑ ہے اور پاس ہی ایک لاش سڑ رہی ہے، جس کی زبان باہر نکل آئی ہے اور آنکھیں پھٹ گئی ہیں۔ باہر تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔ مکان جل رہے ہیں اور دردناک چیخیں اُبھر رہی ہیں۔ پھر ایک آدمی گھبرایا ہوا سا بدرو کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ تانتیا اسے دیکھتا رہا۔ مگر جب وہ اندر آکر لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا تو تانتیا کہنے لگا۔

"وہاں کیچڑ میں کیوں کھڑے ہو۔ ادھر آجاؤ۔ یہاں زمین صاف ہے۔"

آدمی خوف سے چیخ کر بولا "تم کون ہو؟" تانتیا کہنے لگا "میں کوئی بھی ہوں کیچڑ میں کھڑا ہونا ہے تو وہیں کھڑے رہو۔ نہیں تو ادھر چلے آؤ" اور وہ آدمی اسکے پاس آکر چُپ چاپ بیٹھ گیا۔

پھر ذرا ہی دیر بعد وہ آدمی آہستہ سے پوچھنے لگا "تم ہندو ہو یا مسلمان؟"

تانتیا جھنجھلا کر بولا "میں کوئی بھی ہوں۔ ابے ہندو مسلمان کے بچے پہلے یہ بتا کہ کچھ سگریٹ وگریٹ بھی ہے؟"

وہ آدمی کہنے لگا "نہیں میرے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ نہ جانے کس طرح تو جان بچا کر بھاگا ہوں۔ تمہیں سگریٹ کی پڑی ہے" تانتیا ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا "ابے جا بے تو بھی یونہی رہا"

وہ آدمی ذرا دیر خاموش رہکر کہنے لگا "یہاں تو بڑی بدبو آرہی ہے" تانتیا نے ماچس جلائی اور سڑتی ہوئی لاش کو دکھانے لگا "دیکھو یہ کوئی مرا ہوا آدمی سڑ رہا ہے" وہ خوف زدہ ہوکر تانتیا کے قریب سرک گیا اور پھر متاثر ہونے کے سے انداز میں کہنے لگا "ہا بیچارہ!"

تانتیا کہنے لگا "یار دکھ تو مجھ کو بھی ہو رہا ہے۔ پر یہ سرکار بھی بڑی عجیب ہے۔ اتنا گوشت بیکار سڑا جارہا ہے۔ یہی پچھلی جنگ کی بات ہے۔ ہم لوگ برما کے جنگلوں میں لڑ رہے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جاپانیوں نے ہیڈ کوارٹر والی سڑک بمباری سے تباہ کردی اور ہم لوگوں کو راشن ملنا بند ہوگیا۔ بس کچھ نہ پوچھو کہ کیا بیتی۔ ہم لوگوں نے سامان لے جانے والی گاڑیوں کے خچروں کو مار کر کھانا شروع کردیا۔ مگر خچر کا گوشت بہت خراب ہوتا ہے۔ سالا ہضم ہی نہ ہوتا تھا۔ پھر

ہوائی جہازوں سے راشن پھینکا جانے لگا۔ اس میں ہمیں ایسا گوشت ملتا جسے سکھا کر ڈبوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ سچ کہتا ہوں کیا مزے کا گوشت ہوتا تھا۔ اب تمہیں بتاؤ کہ روز جو یہ اتنے بہت سے آدمی بلوے میں مرتے ہیں۔ دیکھو کتنا گوشت بیکار جا رہا ہے۔ سرکار اس کو سکھا کر کیوں نہیں رکھ لیتی۔ کال کے دنوں میں کتنا کام دے گا پھر کال تو یوں بھی پڑ رہا ہے۔ کتنے ہی بھوکوں کا بھلا ہو جائے گا۔ کہو کیسی کہی" اور تانتیا نے اس کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ "ابے تو تو بہت تگڑا ہے۔ تو مرے گا تو بہت سا گوشت نکلے گا اور بہت سی چربی بھی نکلے گی۔" اور وہ آدمی خوف سے اچھل پڑا۔ اس کی جیبیں روپوں کی جھنکار سے کھنک اٹھیں۔ تانتیا نے جھٹ سے اس کی گردن دبوچ لی۔

"ابے تیرے پاس تو بڑی رقم معلوم ہوتی ہے۔ لا نکال" اور وہ آدمی گھٹی ہوئی آواز میں کہنے لگا "میری گردن تو چھوڑ دو" تانتیا نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

وہ کہنے لگا "مجھ ستائے ہوئے کو ستا کر تمہیں کیا ملے گا"

تانتیا ہنسنے لگا "سیدھی سی تو بات ہے۔ رقم ہاتھ لگے گی اور کیا؟" اور وہ اس آدمی کو دھکا دیکر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے گلا دبا کر کہنے لگا "ابے سیدھی طرح نکالتا ہے یا گھونٹ دوں گلا" وہ بدحواس ہو کر کہنے لگا "سب کچھ اندر کی جیب میں ہے، نکال لو" تانتیا نے اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ نوٹ نکالے روپے نکالے اور ریزگاری تک نکال لی۔

وہ خوشامد کرنے لگا "میرے پاس کچھ تو چھوڑ دو"

تانتیا پھر ہنسنے لگا "ابے جا! بہت دن مال لے تم نے ٹھاٹھ کئے ہیں۔ کچھ دن

یوں ہی سہی۔"

"تمہارے دل میں ذرا رحم نہیں۔ میرا گھر جل رہا ہے۔ سب کچھ لٹ گیا۔ بیوی کو بھی مار ڈالا۔ بچوں کو بھی قتل کر دیا۔ میری جوان لڑکیوں کو بھگا لے گئے۔ اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ عزت تھی وہ بھی برباد ہو گئی۔" وہ آدمی بڑا اداس معلوم ہو رہا تھا مگر تانتیا ہنستا رہا "ابے تو اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے تیری لڑکیوں کو کوئی نہ کوئی تو لے ہی جاتا۔ کوئی اور نہ لے گیا وہ لے گئے۔ اس میں کیا ہوا۔"

وہ آدمی خاموش بیٹھا رہا۔ اسے تانتیا سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر اسے اپنی جان پیاری تھی اور وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اور تانتیا نے اسے پھر چھیڑا۔ "ابے خاموش کیوں بیٹھا ہے۔ کچھ باتیں ہی کر،" وہ آدمی جھنجھلا کر کہنے لگا "تم نے آج تک انسانوں کو دکھ ہی پہونچایا ہے۔ یا اور بھی کچھ کیا ہے۔"

تانتیا تلملا کر بولا "ابے! میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے چلچلاتی دھوپ میں سڑکوں پہ محنت کی ہے۔ کڑکڑاتی سردیوں میں پہرہ داری کی ہے۔ میں نے فوج میں بھرتی ہو کر گولیاں کھائی ہیں۔ میں نے چوریاں کی ہیں۔ میں نے جیل کاٹی ہے۔ میں نے مار کھائی ہے۔ میں نے گالیاں کھائی ہیں۔" اور تانتیا تیزی سے کہتے کہتے ایک بار بے نیازی سے ہنسنے لگا "اور اب میں بھوکوں مرتا ہوں۔ شرابیوں کا بچا کھچا کھانا کھاتا ہوں۔ گوشت کے ایک ٹکڑے کے لئے کتوں سے لڑتا ہوں۔ اس سردی میں سنسان سڑکوں پہ ٹھٹھرتا پھرتا ہوں۔ بتاؤ استاد تم نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اور نہیں، تو تمہاری ایسی کی تیسی" اور تانتیا نے اس کے منہ پہ کس کے

تھپڑ مارا" سالا! اُلو کا پٹھا۔ خواہ مخواہ رعب جھاڑتا ہے۔"

وہ آدمی سہما ہوا سا خاموش بیٹھا رہا۔ مگر تانتیا اس بدرو سے اکتا چکا تھا۔ اس آدمی سے اُکتا چکا تھا۔ اس اندھیرے سے اُکتا چکا تھا۔ اور وہ بدرو سے نکل کر باہر سڑک پر آگیا۔ خزاں کی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ رات اور گہری ہوگئی تھی۔ ویران عمارتوں کی پشت پر چاند کی زرد روشنی ابھر رہی تھی۔ بیت جھڑ کے مارے ہوئے سوکھے درخت تارِ عنکبوت کی طرح اُلجھے ہوئے نظر آرہے تھے اور تانتیا درختوں کے لرزتے ہوئے سایوں کے تلے چلنے لگا۔ خشک پتّے اس کے قدموں کے نیچے آسیبی سرگوشیوں کی طرح چرمراتے رہے اور اس کی پشت پر گونجنے والی دردناک انسانی چیخیں مدھم ہوتی گئیں اور سنسان سڑک پر اس کا مہیب سایہ بھوتوں کی طرح جھومتا رہا۔ وہ یوں ہی گم سم سا چلتا رہا پھر ایک موڑ پر سے کسی نے اس کو ٹوکا "کون آرہا ہے؟" تانتیا نے گھبرا کر دیکھا ایک فوجی سپاہی بندوق سنبھالے ہوئے اس کی طرف آرہا ہے۔ تانتیا پلٹ کر دیواروں کے سایوں میں دبکنے لگا۔ وہ چیخ کر تیزی سے بولا "ٹھہر جاؤ" مگر تانتیا نے اپنی چال اور تیز کردی۔ پھر بندوق کی آواز سڑک پر زور سے تھرتھرائی اور گولی تانتیا کی پسلیوں کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ اور سپاہی اس کے قریب آکر ٹھہر گیا۔

تانتیا نے اس کی طرف دیکھا، پھر اُلجھے ہوئے لہجے میں کہنے لگا "جوان! تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے۔ کبھی میں بھی اتنا ہی سچا نشانہ لگاتا تھا۔ پر ان چیزوں کی کون قدر کرتا ہے۔ جنگ ختم ہوگئی اور میرا حال تم نے دیکھ ہی لیا" اور تانتیا نے

ہاتھوں میں دبے ہوئے نوٹ، روپے اور ریزگاری سب کچھ سڑک پر پھینک دیا
سپاہی اپنی بندوق کا سہارا لئے ہوئے حسرت سے دیکھتا رہا۔ تانتیا اس کے اس
انداز پر جھنجھلا گیا "ابے دیکھ کیا رہا ہے۔ اس کو اٹھا لے۔ سالے اکڑتا کیوں
ہے کہیں ایک دن تیرا بھی یہی حال نہ ہو۔ ابے اس وقت یہ رقم کام آئے گی!"
سپاہی نے اس کے ایک لات ماری اور روپیہ اٹھا کر چل دیا۔ تانتیا کے
زخم سے خون بہتا رہا۔ اس کا جسم سنسان سڑک پر پھڑکتا رہا۔ ہوائیں سسکیاں
بھرتی رہیں۔ اور ویران گلیوں میں کتے روتے رہے۔

یہ کرفیو آرڈر کی رات تھی، تانتیا کی زندگی کی آخری رات تھی۔ تانتیا مر گیا
لیکن اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک بھوک زندہ تھی۔

خیال
فروری ۱۹۴۹ء

عصمت چغتائی

کیڈل کورٹ

کچے چمڑے کی مختصر سی گدڑی کچھ زنگ کھائی کیلیں اور نعل ایک آدھ ہتھوڑی، رانپی، سُوا اور چند تسمے۔ یہ ہے اس کا سارا اثاثہ۔ اس کے علاوہ چند پھٹے اُدھڑے جُوتے ایک اُلجھی ہوئی گدڑی، دو چار ٹین کے ڈبے یہ ہے اس کا گھر جس کا ٹھیک ڈاک کا پتہ ہے۔ کیڈل کورٹ کی سوری سے ذرا بائیں طرف کو ایرانی ہوٹل کے سائبان کے نیچے جہاں اوپر سے پھینکے ہوئے کچرے اور پان کی پیکوں سے پوری طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اس کا مکان، گھر، محل، حویلی جو بھی سمجھ لیجئے واقع ہے۔ یہی اس کا وطن ہے اور وہ یہیں کا باشندہ۔ نہ جانے کب سے رہتا ہے۔ اور کب تک رہے۔ اندازہ تو یہی کہتا ہے کہ صاحب لوگوں کے جوتوں پر پالش کرتے کرتے اسے اس نفع بخش پیشے کو اختیار کرنے کا خیال آیا ہوگا۔ اور یہ خیال جب تک آتا رہے گا جب تک کہ ایک دن اسی جگہ مجبوراً اس کی روح اس کے کڑوے کسیلے جسم سے دق ہو کر بھاگ نہ کھڑی ہوگی اور پھر جب وہ حسبِ معمول گودڑ میں سے جہاں وہ روز سورج کے ساتھ ساتھ چھپ جا[illegible] ہے تو [illegible] پڑ نے جوتوں کی قطار لگا کر خام چمڑے کی گدی نہ کھولے گا تو وہ

راہ گیروں کی ٹھوکروں سے بھی نہ جاگے گا تو ناکے پر کھڑا ہوا ایسا ہی اپنا فرض انجام دیتا رہے گا۔ سڑک پر موٹریں دوڑتی رہیں گی۔ ہوٹل میں پیالیاں کھنکتی رہیں گی۔ اور ساری جیتی جاگتی فضا میں وہ سویا پڑا رہے گا۔

پھر جب اس کی نیند کا بھرم کھلے گا تو کیڈل کورٹ کے باسی اور ہوٹل میں آنے جانے والے چہ میگوئیاں شروع کر دیں گے۔ کتے اس کے سرد جسم کو سونگھیں گے۔ اور بسر مکھیاں بھنبھنائیں گی۔ سرکاری لاری آئے گی اور بحیثیت ایک شہری کے اسے اس کا حق سونپ دے گی۔ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا۔ فی الحال تو وہ روز ہوٹل کھلتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ اینٹوں کا مضحکہ خیز دریچہ سا بنا کر اس پر اوولٹین کے خالی ڈبے میں پانی چڑھا دیتا ہے۔ ہوٹل کے پاس رہنے میں اسے کتنے ہی فائدے ہیں۔ علاوہ بزنس کی فراوانی کے عمدہ کھانوں کی لذیذ خوشبو مفت ہاتھ آتی ہے۔ اُبلی ہوئی چائے کی پتیوں کو بوری پر روزانہ حفاظت سے اگر سکھا لیا جائے تو بافراط چائے تیار کی جا سکتی ہے۔ گو یہ پتیاں ابالنے کے بعد خوب مسلنے پر ذرا سا ہی رنگ چھوڑتی ہیں کیونکہ ہوٹل والا خود ان کا پہلے ہی کئی کئی بار خون نچوڑ لیتا ہے جب پھینکتا ہے۔ گرم گرم سیلا پانی پی کر وہ اطمینان سے اپنی دوکان سجانے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ شاید فورٹ کی دوکانوں کے بڑے بڑے مالک بھی اتنا وقت سجانے میں نہیں صرف کرتے ہوں گے۔ وہ بڑی احتیاط سے کچے چمڑے کی گٹھڑی کھولتا ہے ایک ایک ٹکڑے کو جانچتا پڑتالتا ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنی چندھی آنکھوں سے ان ٹکڑوں پر کیا گھورا کرتا ہے۔ پھر سر ہلا کر انھیں درجہ بدرجہ ترتیب دیتا جاتا ہے پھر وہ رنگھیا لی کیلوں کی ڈبیاں اور شیشیاں نکال کر دواؤں کی طرح سجاتا ہے۔

نعل اور چپل کیلیں بڑے حساب سے بچھاتا ہے۔ پھر پرانے جوتوں کی قطار لگانا شروع کرتا ہے۔ اس سجاوٹ میں وہ برابر رد و بدل کئے جاتا ہے حتیٰ کہ کوئی گاہک آکر اسے چونکا نہ دے۔ ایسی صورت پیدا ہوتے ہی وہ نہایت پھرتی سے جوتے کی نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیتا ہے۔ پھر مزے لے لے کر ایک ماہرِ فن جراح کی طرح وہ اس کا ایک ایک جوڑ ٹھوک بجا کر دیکھ لیتا ہے۔ جیسے اسے عشق ہو اُن جوتوں سے۔ ہاتھ میں لیتے ہی پہلے تو وہ بڑے پیار سے اُسے اُلٹتا پلٹتا ہے۔ پھر گاہک کی طرف دیکھتا ہے گویا پوچھتا ہے۔ اب لائے ہو بیچارے کو۔ اب اس میں جان کہاں۔ خیر دیکھتا ہوں۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور پھر اوزار چل پڑتے ہیں۔ جھٹاپٹ سُوا چمڑے میں ڈبکیاں مارتا ہے۔ زنگھیائی کیلیں اپنی اپنی جگہ ڈھونڈھ کر گھس جاتی ہیں اور ہتھوڑی کھٹا کھٹ معاملہ فٹ کر دیتی ہے۔ گاہک پھر مڑ کر تا مسکراتا چل دیتا ہے اور وہ پھر جُوتوں کی قطار نئے سرے سے جاذبِ نظر انداز میں جمانے لگتا ہے۔

کیڈل کورٹ کی موری کے دائیں جانب ایک گیرج ہے۔ جس میں کسی زمانے میں موٹر رہا کرتی تھی۔ پر اب وہ موٹر تو سڑک کے کنارے کھڑی رہتی ہے اور اس کی جگہ پندرہ آدمیوں نے چھین لی ہے۔ بیس فٹ مربع جگہ میں پندرہ جی کس آسن سے اُٹھتے بیٹھتے ہیں یہ کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیونکہ گیرج کا دروازہ اوپر سے ہمیشہ نیچے کھنچا رہتا ہے۔ صرف جُھک کر جانے کا انتظام ہے۔ اگر آپ کو شوق ہو تو کیڈل کورٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ جائیے تو آپ کو گیرج

کے اندر بہت سے میلے پیر، کھلے گھٹنے اور برہنہ کندھے آپس میں گتھم گتھا نظر آئیں گے یہ اعضائے جسم عورتوں کے بھی ہیں اور مردوں کے بھی۔ ماؤں کے بھی اور بہنوں کے بھی۔ بہوؤں کے بھی اور بیٹیوں کے بھی۔ پتہ نہیں وہاں کیا پکتا ہے۔ اور کیا کھایا جاتا ہے۔ ابھلے ہوئے انسان کی بو ہمیشہ بھبکے دیا کرتی ہے۔

اور وہ موٹر جو کچھ دنوں پہلے گیرج میں شان سے رہا کرتی تھی اور سڑک کے کنارے منہ بسورا کرتی ہے روز صبح باپ بھائی یا بیٹا گیرج کے ادھ کھلے پھاٹک میں سے گردن نہوڑا کر نکلتا ہے اور موچی سے ذرا فاصلے پر اپنے ذریعہ آمدنی کو چمکا دمکا کر آئینہ بنا لیتا ہے۔ رات کے چھوڑے ہوئے باسی پھول جھوٹے پتے اور ٹوٹے گلاس موری میں جھاڑ دیتا ہے۔ اور اپنا کاسۂ گدائی چلا کر روانہ ہو جاتا ہے۔

گیرج اور ہوٹل کے بیچ میں ایک پھاٹک ہے یہ کیڈل کورٹ کا پھاٹک ہے جس کے کھمبے پر مالک مکان کا نام اور عمارت کا نام اور سالِ تعمیر کندہ ہے یہ عمارت کیڈل کورٹ ہے۔ کورٹ کے معنی ہیں کچہری، جہاں مقدمے اور چالان وغیرہ ہوتے ہیں۔ مگر یہاں ایسی کوئی حماقت نہیں ہوتی وہاں یہ اور بات ہے کہ نچلے مالے پر رہنے والے فلم اسٹار سے حکومت کو خاص قسم کی پرخاش ہو گئی ہے۔ اس فلم اسٹار کو آپ نہیں جانتے چونکہ اس نے کبھی کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ پھر بھی وہ فلم اسٹار ہے کیونکہ اسے اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن ضرور فلمی دنیا کو اپنی حماقت پر رحم آئے گا اور وہ کسی فلم میں جلوہ افروز ہو کر رہے گا۔

اس کا ذریعہ آمدنی امیدواری ہے۔ وہ اسی امید پر جیتا ہے۔ ویسے اسے کسی نے کبھی بغیر گاڑی کے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ مرغِ زریں کی طرح ٹھمکتا ہیٹ کا چھجہ موڑے ایک سے ایک عمدہ کار سے اترتا چڑھتا دیکھا جاتا ہے کتنی ہی فلمی پریاں اسے ہیرو بنا چکی ہیں۔ جس فلم کمپنی میں جاتا ہے۔ وہاں کی ہیروئن کو لے اُڑتا ہے۔ وہ تنومند ہے خوبرو ہے۔ اس کی پیشانی سے بے رحمی ٹپکتی ہے پر منہ کنواریوں جیسا بھولا ہے۔ وہ نیلے پیلے اور سبز چنگھاڑتے ہوئے رنگوں کے کپڑے پہنتا ہے اور بالوں میں مصنوعی خم بنواتا ہے اور جب فلمی پریاں اس کے لئے کالے بازار سے وہسکی کی بوتلیں لاتی ہیں تو انھیں خالی کر کے وہ ان کے سروں پر پھوڑتا ہے۔ اور جب وہ حاملہ ہو جاتی ہیں تو بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ باوجودیکہ وہ اس قدر جلاد قسم کا مرکھنا دیو ہے۔ پھر بھی اس کے گرد ہمیشہ پریاں پھڑپھڑایا کرتی ہیں۔ شام پڑتے ہی اس کے یہاں گرد و نواح کے رنگین مزاج جمع ہو جاتے ہیں۔ آئے دن ناچ و رنگ کے جلسے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بڑے مقدس انداز میں ان پریوں سے شادی رچا لیتا ہے۔ پھر کچھ دن کے لئے کیڈل کورٹ کی نچلی منزل میں سوت سی ہو جاتی ہے۔ سارے قہقہے چہچہے ایک اُجاڑ قسم کی خاموشی میں ڈوب جاتے ہیں۔

پھر اس کے بالوں کے خم ختم ہونے لگتے ہیں۔ سوٹ ماند پڑ جاتے ہیں اور نچلی منزل میں چھوٹے چھوٹے زلزلے آنے لگتے ہیں کیونکہ وہ زآ ہی کسی فلمی ہیروئن کو شدت سے ایک ہیرو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ دوبارہ بالوں میں خم ڈلوا کر تلاش میں جُت جاتا ہے۔ اور پھر خالی بوتلیں سروں پر پھوٹتی ہیں۔ کیڈل کورٹ کے نواسیوں

کی نیندیں اُچٹتی ہیں اور ایک دن بند ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی بیوی بچا کھچا مال سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی چہچہے شروع ہو جاتے ہیں اور اسی طرح یہ زندگی کی چرخی چلتی رہے گی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ سچ مچ ہیرو بن کر پردۂ سیمیں پر جلوہ افروز ہو جائے گا۔ یا اسی امید میں اس کے گھنیرے بال عمر کی اندھیری وادیوں میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کی کھنچی ہوئی بھنویں جھک جائیں گی اور چمکیلی آنکھیں گدلا جائیں گی۔ اس کے تنے ہوئے پٹھے جھول کھا جائیں گے چیتے جیسی کمر پھیل کر ھپکنا بن جائے گی۔ اور پھر نہ پریاں اس کے گرد منڈلائیں گی اور نہ سرہانے پر خالی وہسکی کی بوتلیں پھڑ وائیں گی۔ اور پھر وہ لٹی کھٹی طوائف کی طرح..... نہ جانے وہ کیا کرے گا۔ زندگی اسے پھٹی جوتی کی طرح گھسیٹتے گھسیٹتے ایکدم چھوڑ کر چل دے گی۔ اور پھر؟ پھر نہ جانے کیا ہو گا۔ اس کا گھر کوئی دوسرا امیدوار لے لے گا۔ اور امید کی شمع جلا کر دکان سجائے گا۔

دو زینے طے کرنے کے بعد کیڈل کورٹ کا پہلا مالا ہے۔ یہاں ایک مرہٹی جوڑا رہتا ہے۔ چھوٹا سا خاندان۔ نوجوان میاں اور کمسن بیوی۔ اور ننھا منّا سا ایک بیٹا اور ایک بوڑھی لڑاکا ماں۔ نوجوان کہیں فورٹ میں کلرکی کرتا ہے اور کمسن بیوی کسی لوکل اسکول میں معلمہ ہے۔ دونوں کی مجموعی کمائی ایک سو دس روپیہ ہے۔ نوجوان گریجویٹ ہے اور اس کی بیوی میٹرک پاس۔ اور یہ دونوں مل کر ایک سو دس روپیہ کما لیتے ہیں۔ بیالیس روپیہ مکان کا کرایہ باقی اڑسٹھ روپے میں کالے بازار سے گیلے کوئلے اور کرکری شکر کے علاوہ چار جانوں کا کھانا پینا سیر تفریح سب کچھ ہو جاتا ہے۔

جب ہندوستان آزاد نہ تھا تب بھی یہ خاندان یہیں رہتا تھا۔ جب یہاں پہ ایک باپ بھی تھا۔ یہ گھر ہمیشہ مشہور لیڈروں کی تصاویر سے آراستہ پیراستہ رہا اور جب ہندوستان آزاد ہوگیا تو سب سے زیادہ روشنی اور جھنڈیاں انہیں کی بالکونی پر لگی تھیں۔ گھر کے دروازے پر، سیڑھیوں پہ اور تصویر کے چوکھٹے میں فریم کیا ہوا "جے ہند" نہایت روشن اور منور رہے۔ کمرے کی سب سے بڑی دیوار پر سوبھاش بابو کی سیلوٹ کرتی ہوئی تصویر ہے اس کے اوپر کچے سوت کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ گئے سال کا ذکر ہے۔ اس سال ۱۵ اگست کو ان کی بالکونی میں جھنڈوں کی تعداد سکڑ گئی تھی۔ اور دیئے دو چار ہی گھنٹے ٹمٹما کر رہ گئے تھے اور دیوار پہ لکھا ہوا جے ہند ماند پڑتا جا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پندرہ اگست کو جب آزادی آئی تو گورنمنٹ نے کنٹرول نہیں کیا اس لئے ساری آزادی بلیک مارکیٹ میں دھر لی گئی۔ جس کا جی چاہے آزادی لے آئے۔ پر ذرا مشکل سے ملتی ہے کیونکہ وہی بات ہے کہ مانگ زیادہ ہے اور سپلائی کم۔ آزادی کوئی ایسی ویسی چیز تو تھی نہیں کہ دھوپ اور ہوا کی طرح ہر ایک ایسے غیرے نتھو خیرے کو بانٹ دی جاتی نہایت احتیاط سے سینت کر رکھی گئی ہے۔ وقت ضرورت بانٹ دی جائے گی۔

اور اسی بٹوارے کی آس لگائے یہ جوڑا زندگی کا قرض اتارتا چلا جا رہا ہے۔ یوں ہی جے ہند اور قومی لیڈروں کے سائے میں کمر جھکائے ایک سو دس روپے میں گھر کی آگ سلگتی رہے گی۔ یوں ہی نوجوان یہاں سے بوزٹ اور فورٹ سے گھر آواگون میں جتا رہے گا۔ اور کمسن بیوی دوپہر کے وقفے میں ننھے کو دودھ پلانے ہانپتی دوڑتی آتی رہے گی۔

پھر ایک دن یہ نوجوان اپنی جگہ منے کو سونپ کر چل دے گا اور وہ ننھا جوان ہو کر اور بھی بڑے بڑے لیڈروں کی تصویروں سے کمرے کو سجائے گا اور سیڑھیوں پر لکھا ہوا "جے ہند" نئے رنگ سے جگمگا اٹھے گا۔ پھر ایک سو دس روپے آئیں گے اور گیلے کوئلوں اور کرکری شکر کے بھینٹ چڑھ جائیں گے۔

دو زینے اور چڑھیئے۔ یعنی زمین سے چار زینوں کی اونچائی پر ایک نہایت اعلیٰ خاندان کی اصلی جیتی جاگتی فلم اسٹار سکونت پذیر ہے۔ وہ میری سہیلی ہے۔ یہ میل جول اس زمانے کی یادگار ہے جب میں نے بمبئی میں پورے طور سے قدم نہ ڈالے تھے۔ اور ہر فلم اسٹار کو جیتا جاگتا دیکھ کر چیخیں نکل جاتی تھیں۔ عرصے سے ہم ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شرکت کرتے آئے ہیں۔ راضی خوشی نہ سہی کم از کم مجھے تو اس کے سارے غموں میں شرکت کرنا ہی پڑتی ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں اچھی خاصی انسان معلوم ہوتی ہے۔ مگر ایک نہایت ہی مکروہ لت اس کو چمٹ گئی ہے اور وہ ہے عشق بازی۔ وہ تعلیم یافتہ مہذب ہے لہٰذا اس کے عشاق میں سے عموماً شعراء، ادیب اور جرنلسٹ ہی پائے جاتے ہیں۔ میری سہیلی کا کہنا ہے نہ پتہ نہیں کہاں تک درست ہے کہ وہ سب کے سب اس کے عشق میں گرفتار ہیں یا کبھی گرفتار تھے یا گرفتار ہونے کے آرزومند ہیں۔ پتہ نہیں اسے یہ شبہ کیوں ہو گیا ہے کہ میں عشق کے معاملے میں ایکسپرٹ ہوں کیوں کہ وہ ہمیشہ تازہ واردات کے موقع پر مجھ سے رائے لیتی ہے جہاں اس کے تازہ عاشق سے چشمک چلی جو کہ ضرور چلتی ہے چونکہ وہ عشق صرف لڑنے، روٹھنے اور منّنے کے لئے کرتی ہے تو میرا دم سوکھ جاتا

ہے۔ آئے دن میری جان پر مقدمے دائر ہونے لگتے ہیں اور تو اور اسے عشق کے جملہ مراحل طے کرنے کے لئے میرا ہی گھر موزوں نظر آتا ہے۔ میرے ہی صوفوں پر بیٹھے بنتے ہیں۔ میرے ہی گلدانوں سے ایک دوسرے کے سر پھٹتے ہیں اور بعض زمانے میں تو مجھے خود اپنے کمروں میں باقاعدہ کھنکار کر ہوک بجا کر جانا پڑتا ہے۔ کتنی بار جی چاہا کہہ دوں تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے یہ دکھڑے سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں کیا میں ایسی بے مصرف ہوں کہ سوائے تم جیسی ناکارہ چیز کے اور کوئی الجھن میری زندگی میں نہیں۔ میں بیٹھ کر تمہارے عاشقوں کے دکھڑے سنوں یا یہ سوچوں کہ اناج کتنا کم ملتا ہے راشن پر۔ چانول تو جیسے بونے سے پہلے بیج سڑ گیا تھا۔ جب سے کنٹرول کھسکا ہے آنکھیں لٹھے ململ کو ترس گئی ہیں۔ کہتے ہیں کفن کا کوٹہ ملتا ہے۔ کاش مرنے سے پہلے وہ کفن والا لٹھا مل جائے تو ایک غرارہ مزے سے بن جائے۔ پھر شکر میں کتنی دھول ہوتی ہے۔ جانو گنے ہی کرکرے بوئے جانے لگے ہیں۔ پر تم کیا جانو ان باتوں کو۔ یہ جو عاشقوں کا چسکا بیٹھے بٹھائے جان کو لگا بیٹھی ہو کہ سال کے بارہ مہینے بس ان ہی کی جان کا رونا کہ اب کون سی فصل آئی۔ کون سے کاٹے جائیں اور کون سے تازہ بوئے جائیں۔ کن کی ادھیڑ بن کی جائے۔ اور کون سے جھاڑ پونچھ پھٹکیلین کی گولیاں ڈال کر اسٹور کر لیے جائیں کہ وقت ضرورت کام آسکیں۔

اور پھر میرا جی لوٹ اٹھتا ہے۔ اور سوچی کی خام جمگھٹے اور پرانے جوتوں والی دکان آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مجھے اس کے عاشق جوتوں کی ایک طویل قطار کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اونچی ایڑی کے۔ نیچی ایڑی کے، بغیر ایڑی کے، ولائتی ہندوستانی سینڈل اور واکنگ شو ڈانسنگ شو اور پلیٹ فارم شو، روپہلے، سنہرے، چمکیلے اور

پھٹے ہوئے چیتھڑے اور گھٹیلے پر کوئی بھی تو ان میں سے فٹ نہیں کسی کا پنجہ کاٹتا ہے تو کوئی ایڑی پر چھالا ڈالتا ہے کسی کا تسمہ ڈھیلا تو کسی کا بکسوا تنگ کوئی بھی تو ایسا نہیں کہ مزے سے پیر میں ڈال کر زندگی کی پگڈنڈی پر ٹھمکتی ٹھمکتی چلی جاؤ۔

ان کے تازہ ترین عاشق سے میرا پرانا بیر ہے۔ وہ ایک عرصے سے مجھ سے ایک فلمی کہانی لکھوانا چاہتا ہے اور اتنے بھاؤ تاؤ کر رہا ہے کوئی دم میں کمر ٹوٹا چاہتی ہے۔ اور وہ بھی سمجھ گیا ہے کہ کچھ دن بعد میں اس کی مرضی کے مطابق کہانی، اس کی مرضی مطابق داموں پر لکھنے پر مجبور ہو جاؤں گی پھر اس میں وہ جملہ رد و بدل کر کے اپنی بوڑھی داشتہ کو میرے تخیل کی پندرہ سالہ چھوکری بنا دے گا اور تھل تھل کرتے رہنے جیسے ہیرو کو جو حاملہ عورت کی طرح پھیل پھیل کر چلتا ہے اور جس کے سینے پر اتنا گوشت ہے کہ بآسانی ستیس نمبر کی بریزیر پہن سکتا ہے جواں سال ہیرو کا پارٹ دے دے گا۔ پھر جب یہ بوڑھی گھوڑی اور ڈھیلا ہاتھی پھدک پھدک کر باغوں میں دوگانیں گائیں گے میرا سر شرم سے نیچا ہو جائے گا۔ میں کسی کو نہ بتاؤں گی کہ یہ کہانی میں نے تخلیق کی تھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ کہانی جھینگے کوئلوں، بھیگی شکر اور کیاب لیٹے نے سوچی تھی ــــ کالے بازار کے سکون نے اسے خریدا تھا اور مجھے جو معاوضہ ملا اس سے میں کالے بازار سے لٹھا اور ململ خرید دوں گی۔ اور بھیگے کوئلے کہ اس کی آنچ سلگتی رہے اور پھر مجھے کہانی لکھنے کا معاوضہ ملے۔ یہ ایک عجیب و غریب چکر ہے جس میں فلم ڈائرکٹر اور کالا بازار ایک دوسرے کی دُم پکڑے چک پھریاں لے رہے ہیں۔ میں فلم ڈائرکٹر کو اور فلم ڈائرکٹر کالے بازار کو اور کالا بازار مجھے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اس چکر میں مجھے کتنی ستلیاں آتی ہیں! ـ خالی ستلیاں پھل ندارد! ـ اور یہ

متلیاں یونہی آتی رہیں گی۔ یہاں تک کہ فلم اسٹار کے چھدرے بال بالکل جھڑ جائیں گے چہرہ ناقابلِ مرمت ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے عاشقوں میں سے کسی ایک کے حق میں قرعہ ڈال دے گی۔ اور اس کے گھر میں بیٹھ کر موٹی نہ ہونے کی فکر میں پڑی پھولا کرے گی۔ اور ایک دن فلمی کہانی لکھتے لکھتے میں اپنا قلم چبا کر نگل جاؤں گی۔ اور ان گیلے کوئلوں کو اتنا پھونکوں گی کہ وہ بھڑک اٹھیں گے۔

اگر آپ کی ٹانگیں شل نہ ہو گئی ہوں تو دو زینے اور طے کر ڈالئے یہ کیڈل کورٹ کا تیسرا مالا ہے۔ اگر آپ دروازے پر دستک دیں تو ایک اجاڑ صورت مریض دروازہ کھول کر جھانکے گا اور سہم کر آپ سے درخواست کرے گا کہ بھائی غل کیوں مچاتے ہو خواہ غل، بالکل نہ مچ رہا ہو۔ یہ بے چارہ ایک مزدور پیشہ آدمی ہے۔ یہ جو آپ کو سمندر کے کنارے چاٹ پکوڑی کی دوکانیں نظر آتی ہیں۔ یہ قریب قریب نصف اسی کی ہیں۔ جنھیں اس نے ٹھیکہ پر دے رکھا ہے۔ وہ نہایت ذلیل درجے کے ٹھگ ہیں اور بہت کم منافع لاتے ہیں۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ سیرین لائن پر اس کی ایک قطار میں تین عمارتیں ہیں۔ باندرا میں دو بنگلے ہیں۔ ایک تو غریب نے اپنے ذاتی مصرف کے لئے بنوایا تھا۔ تمام ایرکنڈیشن کرایا مگر پھر شرنارتھیوں پر دیا کھا کر صرف پچیس ہزار پگڑی لے کر دیدیا۔ بے چارہ بلڈنگ اپنے لئے بناتا ہے لوگ لے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود اس بوسیدہ عمارت میں رہتا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ مکان کی نیوپڑی اور پگڑیاں ٹپکیں۔ کرے بھی تو کیا؟ لوگ چھوڑتے ہی نہیں۔ اب وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنے موجودہ مکان کو پگڑی پر دے کر خود فٹ پاتھ پر سوچی کے شانے سے شانہ ملا کر پڑ جائے گا۔ دنیا اسے

سرمایہ دار سمجھتی ہے حالانکہ اس کی روح تک ننگی بُچی ہے۔ اس کا سارا روپیہ کاروبار میں پھنسا ہوا پھولتا جا رہا ہے۔

ان مکانوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر کپڑے کی اس کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ یہاں وہ مل سے پورے تھان لا کر ان کے کٹ پیس بنا کر کالے بازار کے بھاؤ بیچتا ہے۔ یہ فٹ پاتھ پر سارے بمبئی میں کالا بازار بڑا جگمگاتا ہے۔ مگر اسے نہ پولیس کا سپاہی دیکھتا ہے نہ ہمارے دیس کے مقدس لیڈر۔ جیسے وہ جادو کی ٹوپی پہنے ہو۔

دو زینے اور گھسیٹ ڈالیے۔ اپنی ٹانگوں کو ویسے دم تو نہ رہا ہوگا۔ یہ کیڈل کورٹ کی چھت ہے۔ یہاں صرف ایک کوٹھری ہے جس میں مالکِ مکان کا فالتو کوڑا مثلاً پرانی ٹنکی ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں۔ موٹر کے گھسے ہوئے ٹائر، خاک دھول جھینگر اور مکڑیوں کے درمیان ایک میلی سی دری انسانی ہاتھوں سے بچھائی نظر آئے گی۔ ایک طرف کچھ نئے پرانے کاغذوں، رسالوں، اخباروں کا ڈھیر، رسی پر میلے کپڑے، ایک کونے میں ایک انگیٹھی جس پر سیاہ المونیم کی کیتلی اور دو چار پڑیاں چائے گڑ شکر کی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی انسان کی قسم کی شئے بھی بسیرا لیتی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس پُراسرار ہستی کے دیدار سے مستفید ہو چکے ہیں۔ رات کو آخری ٹرام کے رک جانے کے بعد کیڈل کورٹ پر حیرت انگیز سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایک پُراسرار قدموں کی چاپ گونجنا شروع ہوتی ہے۔ نپی تلی تھکن میں ڈوبی ہوئی چاپ جیسے ہزاروں قدم ایک ہی سر میں غرق چل پھر رہے ہوں۔ پھر یہ چاپ کیڈل کورٹ کی طرف سرکنا شروع ہوتی ہے

اور پھاٹک میں داخل ہو کر لیسے اور تاریک زینوں پر رینگنے لگتی ہے۔ اُسی وقفے سے اسی وزن سے قدم ایک ایک سیڑھی پر گرتے اٹھتے ہیں۔ اور بغیر سستائے کیڈل کورٹ کی چھت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر کبھی رات کو ایک بجے کے بعد کیڈل کورٹ میں آنکھ کھل جائے تو آپ ان قدموں کو سنتے سنتے کانپ اٹھیں گے۔ جیسے کوئی روح عالم بالا کو چڑھ رہی ہو ایک ایک چاپ گن لیجئے۔

یہ قدم ایک عجیب غریب شئے کی ملکیت ہیں۔ میں اسے شئے ہی کہوں گی۔ کیونکہ کیڈل کورٹ کے باسی نہ اس کا نام جانتے ہیں نہ مذہب۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے انھیں بھی شک ہے کہ وہ پتہ نہیں زندہ ہے یا کسی مُردے کا بھوت۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کوئی پریشان روح ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں سرکاری جاسوس ہے کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فرار شدہ مجرم ہے اور اس کے نام کا وارنٹ نکلا ہوا ہے۔ اور واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ایک بار سُنا کہ وہ ایک ایسے انجمن سے وابستہ ہے جس کا ہر پرچہ ضبط ہو چکا ہے یا قابل ضبط ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ کسی مشاعرے میں اس کو پولیس نے دھر لیا۔ پھر ایک ناٹک میں کچھ ایسا فساد انگیز مظاہرہ کیا کہ پولیس نے گھیر لیا۔ مگر اس کی ہستی کچھ کھسلنی ہے کہ نہ جانے کہاں دبک جاتا ہے۔ وہ جیسے کھٹمل ہوتا ہے نا ضدی قسم کا گُدڑی میں کاٹ لیا اور اس سے پہلے کہ شکار سنبھلے پنڈلی میں جھٹک لیا۔ پنڈلی مسلی تو کمر میں دو ودڑے ڈال دیئے۔ تو یہی صفت اس کی ہے۔ گورنمنٹ جھنجھلا رہی ہے، کھلا رہی ہے اور سر پیٹ رہی ہے۔ پولیس دوڑ رہی ہے۔ مگر یہ اس کی ٹانگوں میں سے نکل کر بھاگ جاتا ہے۔ کیڈل کورٹ کے سارے کرایہ دار جانتے ہیں کہ وہ یہاں

رہتا ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اسے پکڑوا دے۔ ایک دفعہ کسی نے کوشش کی بھی تو وہ پولیس کے جانے سے پہلے جھینگر بن کر غائب ہوگیا۔ اور پھر کئی مہینے وہ پُراسرار پیروں کی چاپ کیڈل کورٹ کے زینوں پہ نہ سرسرائی۔ لیکن پھر ایک دن اسی وقت اسی طرح وہ ہزاروں پاؤں ایک نئے سر میں ڈوبے، پھر سے چڑھنے اُترنے لگے جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہی پھٹا پتلون اور قمیص ہے۔ وہی پچکے گال اور اُلجھے ہوئے بال ہیں۔ شاید یہ وہی لوٹ کر آ گیا ہے۔ مگر شاید۔ کیونکہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

اور یہ پُراسرار قدم ہمیشہ اسی طرح رات کی پُراسرار تاریکی میں گونجتے رہے ہیں۔ ایک تھک جائیگا تو دوسرا جوڑا ان کی جگہ لے گا۔ اور دوسرا تھک جائیگا تو تیسرا اور یہ لامتناہی قدموں کا سلسلہ اسی طرح بغیر لغزش کھائے چلتا رہے گا اور ایک ایک قدم ہزاروں قدموں میں بستا چلا جائیگا۔ تو یہ کیڈل کورٹ ہے اوپر سے نیچے تک، فٹ پاتھ سے لیکر خالی آسمان تک اگر آپ کو ایک پلنگ جگہ کی ضرورت ہو تو دھتہ سے کہیئے۔۔۔۔ وہ آپ کو نہایت نامعقول پگڑی کے عوض میں ایک آدھ کو ناکھدرا رہنے کو دیدے گا۔ وہاں آپ مزے سے رہیئے اس امید پہ کہ ایک دن کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ جب یہ لیڈروں کی تصویریں جاگ پڑیں گی اور شکر میں سے ریت کے ذرے چٹان ڈالیں گی۔ ان گیلے کوئلوں کو اتنا دھونکیں گی کہ ان میں سے شعلے بھڑک اٹھیں گے اور یہ ٹھٹرن اور فاقے ختم ہو جائیں گے اور موچی کے سر پر کوڑا نہ برسے گا۔ اور کیڈل کورٹ کی چھت پر چھپے ہوئے جھینگر، بوسیدہ مال کو چاٹ جائیں گے۔۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔۔ بھلا کہیں تصویریں بھی جاگا کرتی ہیں

شاھراہ
نمبر ا

فکر تونسوی

میرے پیارے ابّا

نہ جانے میرا یہ خط تمھیں ملتا بھی ہے کہ نہیں، کیونکہ امی کہتی تھیں۔ ڈاک خانہ والے تمھارا ہر خط کھول کر پڑھ لیتے ہیں اور اکثر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔

اچھا ابا! سب سے پہلے یہ بتاؤ، کیا مجھے ان ڈاکخانے والوں پر غصہ نہیں آنا چاہیئے۔ بھلا تم نے ان کا کیا بگاڑا ہے جو تمھارا خط روک لیتے ہیں۔ کسی کا خط کھول کر پڑھ لینا کتنی بری بات ہے۔ کیا ڈاک خانہ کے بابوؤں کو بری اور اچھی باتوں کی بھی سمجھ نہیں؟ میرا خیال ہے کہ سکول کی کتابوں میں تو انھوں نے ضرور پڑھا ہوگا کہ اچھی بات کونسی ہوتی ہے اور بری کونسی، پھر وہ سکول کا پڑھا ہوا بھول کیوں گئے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسکول میں پڑھی ہوئی اچھی اور بری باتیں اور ہوتی ہوں اور سکول سے باہر کی اچھی اور بری باتیں اور؟ ——

جب تم جواب لکھو تو میرا یہ شک ضرور دور کر دینا۔ ایک بار میں نے اپنے ماسٹر جی سے بھی یہی سوال کیا تھا تو انھوں نے مجھے جھڑک دیا تھا اور کہا تھا کہ تمھارے ابا نے تمھارا دماغ بگاڑ دیا ہے جو ایسی الٹی پلٹی باتیں سوچتا ہے۔

ابا! اگر تم بھی واقعی الٹی پلٹی باتیں سوچتے ہو۔ تو بہت برا کرتے ہو۔ دیکھو! اس سے تمہارا دماغ بگڑ گیا ہے، ماسٹر جی کہتے تھے جب کسی کا دماغ بگڑ جاتا ہے تو وہ خود بھی دُکھی رہتا ہے اور سارے خاندان کو بھی دُکھی بنا دیتا ہے اور ابا! اگر تم ناراض نہ ہو جاؤ، تو کہہ دوں کہ ہمارا سارا گھر واقعی دُکھی ہے اور تم بھی تو کتنے دُکھی ہو۔ اب دیکھو تم مجھ سے دُور، امی سے دور، سوشی سے دور ——— رہ رہے ہو۔ کیا تمھیں ہم سے دور رہ کر دکھ نہیں ہوتا۔ ضرور ہوتا ہوگا۔ امی تو یونہی سب مجھے بہلانے کے لئے کہتی ہوگی کہ تم کبھی نہیں روئے۔ تمہارا کلیجہ پتھر کا ہے۔ تمہاری آنکھیں خشک لکڑی کی طرح ہیں اور ان میں ایک آنسو تک نہیں آتا لیکن میں امی کے جھوٹ اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب کہ میں تمہارے بغیر کئی بار رونے لگ جاتا ہوں، امی ہوتے ہوئے سسکیاں بھرنے لگتیں ہیں۔ سوشی رات کو ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور چیخنے لگتی ہے، تو کیا تم ہمارے لئے ایک آنسو تک نہیں بہا سکتے ہوگے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا دل اتنا کٹھور نہیں ہو سکتا۔ کٹھور دل والے تو کسی سے پیار تک نہیں کرتے۔ لیکن جب تم یہاں ہوتے ہو تو ہمیں کتنا پیار کرتے ہو، گدگدیاں کر کے مجھے لوٹ پوٹ کر دیا کرتے ہو ——— جہاں اب تم رہتے ہو۔ وہاں تم کو گدگدیاں کروانے والا بھی کوئی نہیں ملتا ہوگا۔ امی کہتی تھیں، اب تم میلے کچیلے مزدوروں اور گندے کسانوں اور اسی قسم کے گھٹیا آدمیوں سے پیار کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں ابا! تمھیں کیا مزا آتا ہوگا۔ ان سے پیار کرنے میں اور پھر سُنا ہے کہ ایسے لوگوں کو پیار کرنے سے بڑے بڑے افسر لوگ تم سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ جانے تم ان افسروں سے کیوں نہیں ڈرتے، میں تو

بڑا ڈرتا ہوں۔ ان سے ہمارے اسکول میں جب بھی کوئی بڑا افسر آتا ہے۔ تو میری تو مارے خوف کے گھگھی بندھ جاتی ہے۔ اور بولا تک نہیں جاتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات میرے منھ سے نکل گئی تو کہیں یہ صاحب مجھے ہنٹر ہی نہ مار دیں۔ تھانے ہی میں نہ لے جائیں۔ میرا کہنا مانو تو پیارے ابّا! ان افسروں کی دشمنی مول نہ لو۔ ورنہ وہ تمھیں ہنٹر مارنے لگیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ تمھیں تھانے لے گئے تو........ تو........ اُف! یہ تھانے والے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی جمعہ کمہار کی تو ایک بار تھانے والوں نے چمڑی اُدھیڑ دی تھی۔ بیچارہ لہو میں لت پت ہو کر آ گیا تھا۔

تمھیں سمجھاتے ہوئے بھی تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ سوچتا ہوں، کہیں تم یہ سمجھنے لگو کہ میں پانچ چھ جماعتیں پڑھ کر بڑا گستاخ ہو گیا ہوں۔ ابا! تم تو خود اتنے عقلمند ہو۔ امّی کہتی تھیں تمھارے ابا بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت بڑے شاعر ہیں۔ بہت بڑے ادیب ہیں۔ اور ملک بھر میں ان کی نظموں اور کہانیوں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ سچ سچ ابا! جب میں امّی کی یہ بات سُنتا ہوں تو خوشی سے میرے بدن میں کچھ ہو سا جاتا ہے۔ اور میں اپنے دوستوں میں بیٹھ کر بڑے فخر سے کہا کرتا ہوں کہ میں بہت بڑے آدمی کا بیٹا ہوں۔ لیکن ابا! میری اس بات سے وہ بنواری سیٹھ کا لڑکا گردھاری اور ڈپٹی صاحب کا لڑکا مادھو بہت جلتے ہیں۔ اور ہاں راجی بھگت کا لونڈا شرابی بھی کہتے ہیں کہ تمھارے ابّا کو تو سرکار جب چاہے خرید لے، چاہے جیل میں ڈال دے۔ وہ نہ تو خدا کو مانتا ہے

نہ سرکار کو۔ سچ ابا! کیا تم سرکار اور خدا کو واقعی نہیں مانتے۔ مادھو کہتا تھا جو آدمی خدا اور سرکار کو نہیں مانتا وہ نہ تو بڑا آدمی بن سکتا ہے اور نہ پیٹ بھر روٹی کھا سکتا ہے۔ پیٹ بھر روٹی والی بات تو شاید اس لونڈے مادھو کی سچی بھی ہے کیونکہ میں نے اور امی نے اور سوشی نے کئی بار روٹی نہیں کھائی آٹا ہی نہیں ملتا تھا۔ ابا! لیکن بڑے آدمی تو تم ہو! تمھاری اتنی کتابیں ہیں، کتنی اچھی اچھی نظمیں لکھتے ہو تم، کتنے ہی رسالوں میں تمھاری کہانیاں چھپتی ہیں کئی رسالوں میں تو تمھاری تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ ہمارے گھر کتنے ہی ایسے رسالے آتے ہیں۔ جب تم آؤ گے تو میں تمھیں سب دکھاؤں گا۔ میں نے سوشی سے چھپا کر الماری کے پیچھے رکھ چھوڑے ہیں۔

اچھا ابا ایک بات بتاؤ۔ تم اتنی اچھی اچھی اور بڑی نظمیں اور کہانیاں جو لکھتے ہو۔ کبھی تم نے ایسی نظم بھی لکھی جیسی ہماری کتاب میں ہے۔

تری شان جل جلالہٗ

تو ہے سب کا رازق و رہنما   تری شان جل جلالہٗ

کتنی اچھی نظم ہے۔ یہ ابا! ہم نے جب اسکول میں مل کر گائی تھی، تو صاحب بڑا خوش ہوا تھا۔ یہ صاحب ایسی نظموں سے بہت خوش ہو جاتے ہیں، تم بھی ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جو افسر تم سے ذرا ناراض ہو، بس اسے ایسی نظم لکھ کر سنا دو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ خوش بھی ہو جائیگا اور تمھیں شاید انعام بھی دے گا۔ ہمیں تو خوش ہو کر اس نے اچھے اچھے کھلونے انعام میں دیئے تھے۔ ہمارا ماسٹر کہتا تھا کہ تمھارا ابا ایسی نظمیں لکھ

ہی نہیں سکتا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہائے ابّا! اگر تم کوئی ایسی نظم لکھ کر بھیج دو تو میں اس ماسٹر کو شرمندہ تو کر دوں گا۔

پرسوں چچا ملہوترہ آئے تھے۔ کہتے تھے، تمھارے ابا پندرہ دن تک فاقے کرتے رہے اور پھر تنگ آکر سرکار کے ایک رسالے میں نوکری کر لی۔ ابا! بس مجھے تم سے یہ بڑی شکایت ہے۔ تمھیں آخر کیا غم تھا کہ اتنے دن فاقے کرتے رہے۔ فاقے کرنے سے بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ دماغ کام نہیں کرتا ہونٹ سوکھ جاتے ہیں۔ اتنے بڑے عقل والے ہو کر کبھی کبھی تو تم ایسی باتیں کرنے لگتے ہو جن سے مجھے بھی خواہ مخواہ غصہ آجاتا ہے۔ بھلا فاقہ کرنے میں کیا مزا آتا ہے تمھیں، اور تو اور امّی بھی پچھلے دنوں کچھ فاقے کر چکی ہیں۔ کہتی تھیں۔ تمھارے ابا نہیں آئے اس لئے ان کی یاد میں فاقے کرتی ہوں۔ جھوٹی کہیں کی۔ جیسے میں جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ فاقے کیوں کرتی تھیں۔ چچا ملہوترہ اگر گندم کی بوری نہ بھجوا دیتے تو وہ اب بھی فاقے کر رہی ہوتی۔ سچ پوچھو ابا! میں تو اس فاقے کے سخت خلاف ہوں۔ میں تو ہمیشہ امی سے لڑ پڑتا ہوں کہ میں بالکل فاقے نہیں کروں گا۔ چنانچہ کھانے کے وقت میں چوری چھپے بھاگ کر جمعہ کمہار کے گھر چلا جاتا ہوں اور وہ مجھے ساگ اور چنوں کی گرم گرم روٹی کھلا دیا کرتا ہے۔ ابا! یہ جمعہ کمہار تمھیں بہت یاد کرتا ہے۔ کہتا تھا تمھارا ابا آدمی نہیں دیوتا ہے دیوتا۔ سرکار کے خلاف ایسی ایسی زوردار باتیں لکھتا ہے کہ سب عش عش کر اٹھتے ہیں۔ جمعہ کمہار کی یہ بات مجھے اچھی تو لگتی ہے مگر سرکار کے خلاف والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جمعہ بھی سرکار کو کوستا ہے، چچا ملہوترہ بھی

کوستا ہے، پھوپھو ریلوائی بھی کوستا ہے۔ اور تم بھی کوستے ہو، کیا سرکار ایسی ہی بری ہے کہ اسے ضرور کوسنا پڑتا ہے۔

لیکن خیر، یہ اچھا ہوا، کہ تم نے سرکار کی نوکری کر لی۔ اب تو تم اسے نہیں کوسو گے نا؟ ابا! میرے پیارے ابا! پرماتما کے لئے تم سرکار گورمنٹ کو سا کرو ورنہ میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں ہمیں وہ مکان سے نہ نکال دے، وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک انسپکٹر ایک دن ہمارے گھر آیا تھا کہتا تھا سرکار کا حکم ہے کہ مکان خالی کر دو، کیونکہ تمھارا ابا سرکار کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا پھرتا ہے۔ ہائے ابا! اگر ہمیں مکان سے نکال دیا اس نے تو ہم کہاں رہیں گے؟ کہاں سوئیں گے؟ رات کو کتنی سخت سردی ہوتی ہے، میرے اچھے ابا! بس میری یہ بات مان لو کہ لوگوں کو مت بھڑکایا کرو۔

لیکن ایک بات میرے دل میں ابھی تک کھٹک رہی ہے، چچا ملہوترہ کہتے تھے کہ تم یہ نوکری کبھی نہیں کر سکو گے اور پاگل ہو جاؤ گے۔ آخر کیوں؟ آخر کیوں؟ اور تو اور یہ جمعہ کمہار بھی کہتا تھا کہ تمھارے بابوجی یہ نوکری کبھی نہیں کریں گے۔ میرا خیال ہے ابا! یہ جمعہ کمہار اور ملہوترہ ہی تمھیں کوئی پٹی پڑھاتے ہوں گے۔ ورنہ نوکری نہ کرنے کی کیا وجہ ہے۔ کیا جب تم نوکری کر لوگے، تو جمعہ کمہار کو بھول جاؤ گے۔ چچا ملہوترہ کو بھی، پھوپھو ریلوائی کو بھی، یہ سب ایسا ہی کہتے تھے میں انھیں لاکھ سمجھاتا رہا کہ بابا! وہ کبھی نہیں بھولیں گے تمھیں۔ اتنا پیار کرتے ہیں وہ تم لوگوں سے، مگر نہ جانے انھیں کیا شبہ پڑ گیا ہے کہ میری بات پر توجہ ہی نہیں دیتے۔ میں سوچتا ہوں تمھاری نوکری لگ جائے گی، تو تم پھر

بہت سے پیسے، روپے اور نوٹ لایا کروگے ہ ــ کیوں میں غلط کہتا ہوں' ڈپٹی صاحب کے یہاں کتنے نیلے پیلے نوٹ آیا کرتے ہیں۔ وہ بھی تو نوکری کرتے ہیں نا ہ ـــــــ پھر میں بھی مادھو اور گردھاری کی طرح سوٹ پہنا کرونگا اچھی اچھی مٹھائیاں کھایا کروں گا۔ موٹر میں بیٹھ کر سنیما جایا کروں گا۔ ہیں نا ابا! نوکری کتنی اچھی چیز ہے۔ میں کہتا ہوں اگر تم وہاں نوکری نہیں کر سکتے تو مجھے بلوالو۔ میں وہاں نوکری کروں گا۔

امی مجھے ہر دن سمجھایا کرتی ہیں کہ راتا بیٹے! یوں ضد نہیں کیا کرتے۔ اگر تمھارے ابا نوکر ہو گئے تو ان کی ساری عزت اور شہرت جاتی رہے گی، کیونکہ سرکار ان سے جو چاہے گی لکھوائے گی۔ اور انھیں لکھنا پڑے گا ـــــــ اوّل تو میرا جی چاہتا ہے کہ امی کی بات کو سرے سے مانوں ہی نہ اور اگر مان بھی لوں تو سرکار کوئی بُری اور گندی باتیں لکھنے کے لئے تھوڑی کہے گی تھیں، اور پھر سرکار بھی انھیں لوگوں کے لئے لکھوائے گی جن کے لئے تم آج تک لکھتے رہے ہو۔ مگر امی کہتی تھیں کہ تمھیں اس نکتے کی سمجھ آ ہی نہیں سکتی۔ بس، اسی لئے امی کبھی کبھی مجھے بہت بُری لگتی ہیں۔ اتنے بڑے شاعر اور ادیب کا بیٹا ہوں کیا اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ سرکار کبھی بُری نظمیں لکھنے کے لئے نہیں کہے گی۔ وہ بھی تو آخر لوگوں کے بھلے کے لئے ہی راج کرتی ہے۔

اچھا چھوڑو۔ ابا! تمھیں ایک دلچسپ بات سناؤں۔ کل بازار میں سے ایک بہت بڑا جلوس گذر رہا تھا۔ کتنے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے وہ۔ اور گا رہے تھے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ تمھارا دہی گیت گا رہے تھے جو جمعہ

کمہار کو بھی یاد ہے۔ اور مجھے روز سنایا کرتا ہے ؎

ہم دھرتی کے سُرخ ستارے
ہم سے آنکھیں کون ملائے

ابا! تم وہ گیت سنتے تو بہت خوش ہوتے۔ میں نے تو جونہی یہ گیت سُنا دوڑا دوڑا امی کے کمرے میں چلا گیا۔ اور اس کی اُنگلی پکڑ کر اسے گھسیٹنے لگا۔ "امی، امی! آؤ، سنو، ابا کا لکھا ہوا گیت ——— یہ ہزاروں لوگ گا رہے ہیں۔ آ ہا ہا۔ امی! ابا کا گیت گا کر یہ لوگ کتنے خوش ہو رہے ہیں ——— " ——— لیکن ابا! شکایت کی بات نہیں، امی نے میرا ہاتھ زور سے جھٹک دیا تھا۔ اور سسکیاں بھر بھر کر ہولے ہولے رونے لگتی تھی بھلا اس میں رونے کی کیا بات تھی۔ کیا امی تمہارے اس گیت سے خوش نہیں ہوتی۔ کہتی تھی۔ یہ تمہارے ابا کا گیت ہے ہی نہیں۔ جھوٹی کہیں کی۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ایک دن امی سے روٹھ کر تمہارے پاس چلا آؤں اچھا۔ اب جب تمہاری نوکری لگ گئی ہے، تو مجھے ضرور بلوا لینا۔ پھر میں دیکھوں گا امی کیسے روتی ہے تمہارے سامنے؟

ہاں ابا! وہ لال لال آنکھوں والا، جو خاکی کوٹ پہنا کرتا تھا۔ اور کئی بار ہمارے گھر کے باہر بیٹھا رہتا تھا۔ اور جسے ایک بار تم نے زور سے جھڑک دیا تھا وہ اب بھی کبھی کبھی ہماری گلی میں آتا ہے۔ دو تین بار مجھے مٹھائی بھی کھلائی تھی اس نے، تمہارے ابا کہاں ہیں آج کل؟ پہلے تو میں نے سوچا کہ تمہاری طرح جھڑک دوں اُسے کہ تم کون ہوتے ہو جی پوچھنے والے

پھر خیال آیا کہ صاف صاف کہہ ہی دوں اسے۔ اب بھلا کاہے کا ڈر ہے اس سے۔ امی بھی تو کہا کرتی تھیں کہ جب تمھارے ابا نوکری کر لیں گے، تو یہ لال لال آنکھوں والا آنا بند کر دے گا۔ چنانچہ میں نے اسے چھاتی تان کر کہہ دیا تھا کہ بھائی صاحب! اب تم آنا بند کر دو۔ کیونکہ میرے ابا سرکار کی نوکری کرتے ہیں ——— اس پر ابا! ——— اس بیچارے کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ پھر کہنے لگا۔ بڑے چالاک ہو اپنے باپ کی طرح۔ تمھارا باپ سرکار کی نوکری کبھی کر ہی نہیں سکتا ——— چاہے بھوکوں مر جائے۔ مجھے اس کی بات پر بڑا غصہ آیا۔ جی تو چاہا، اسے کہہ دوں، ہم کیوں بھوکوں مریں گے جی، کیا میرا باپ تمھاری طرح کوئی جاہل ہے۔ جو نوکری نہیں کر سکے گا۔ سرکار تو اس کی منتیں کرتی پھرتی ہے ——— مگر میں کہہ نہ سکا۔ اور بھاگ آیا۔ اور جمعہ کمہار کے گھر گھس گیا۔ ابا! اب تم یہاں حکم بھیج دو کہ اب وہ لال لال آنکھوں والا تمھارے متعلق ایسی باتیں نہ کیا کرے۔ ہوگا کوئی اے، بی، سی، ڈی والا۔ ہم کوئی اس کا دیا کھاتے ہیں۔ میں نے تو وہ مٹھائی بھی نالی میں پھینک دی تھی جو اس نے مجھے لیکر دی تھی۔

ابا! میں تمھیں باتیں تو بہت سی بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ جاتے جاتے تمھیں جمعہ کمہار کی ایک اور بات بتا دوں، آج شام کو امی سے کہہ رہا تھا۔ رانی بٹیا! نگیش بابو اب سرکار کے لئے لکھیں گے تو کیا خاک لکھیں گے۔ بس افیون ہوگی افیون، جسے پی کر سب کو نیند آ جائیگی

میں اسے کہنا چاہتا تھا، میرے ابا کوئی افیون بیچنے والے تھوڑی ہیں، یہ تہمت ان پر کیوں لگاتے ہو جمعہ دادا! مگر جمعہ تو بس جیسے غصے میں آیا ہوا تھا۔ بس بڑبڑ کئے جاتا تھا۔" رانی بٹیا!"

میں بابو کو زوردار چٹھی لکھوں گا۔ وہ ہمارے ہیں، وہ ہمارے لئے لکھیں گے۔ آگ لکھیں گے، شعلے لکھیں گے، انگارے لکھیں گے۔ اگر وہ ہمیں سرکار کے کہنے پر افیون لکھ کر دیں گے تو ہم کہیں گے، بابو جھوٹا تھا۔ دھوکہ باز تھا۔ مکار تھا۔ اس نے پیٹ بھر روٹی کھانے کے لئے ہمیں چھوڑ دیا۔ اس نے تو ہمیں کہا تھا کہ جمعہ دادا! جب تک تمھیں اور تمھارے کروڑوں بھائیوں کو پیٹ بھر روٹی نہیں ملے گی۔ وہ انگارے، آگ اور شعلے ہی لکھا کرے گا۔ وہ لوگوں کو بتا دے گا کہ ہر آدمی کو کھانے کے لئے روٹی، پہننے کے لئے کپڑا اور رہنے کے لئے مکان ملنا اس کا انسانی حق ہے۔ کیا وہ سرکار کے جھوٹے ٹکڑوں کی خاطر اپنے آپ کو بیچ دے گا۔ کیا اس کا دماغ بھنا نہیں اٹھے گا۔ کیا اسے راتوں کو نیند آئے گی۔ کیا اس کی رگیں نہیں تن جائیں گی؟ کیا وہ پاگل نہیں ہو جائے گا افیون بیچ کر —————— میں اسے زوردار چٹھی لکھوں گا۔ رانی بٹیا! کہ وہ افیون مت بیچے۔ وہ ہم سے غداری نہ کرے۔ میں جانتا ہوں، کہ نگیش بابو سے تمھارے اور ننھے کی اور سوشی کی بُری حالت نہیں دیکھی جاتی۔ تمھارے فاقوں کے خیال سے وہ تڑپ اُٹھتا ہوگا۔ رہ رہ کر کروٹیں بدلتا ہوگا۔ لیکن یہ تو ہوگا رانی بٹیا! یہ تو ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا تو بات کیسے بنے گی۔ ہم سب کی بھوک کیسے مٹے گی۔ میں کہتا ہوں نگیش بابو تمھاری

فکر ہی کاہے کو کرتے ہیں۔ ڈال دے سرکار انھیں جیل میں۔ تو کیا میں مرگیا ہوں۔ میں دن رات کام کر کے بھی تمھیں اور ننھے کو کھلاؤں گا رانی! میرے گھر مکی کی روٹیاں اور ساگ تو ہے۔ ٹوٹا پھوٹا مکان تو ہے۔ موٹا کھردرا کپڑا تو ہے۔ تو یہی سہی ــــــــــ

اسی طرح ابا! جمعہ بڑے جوش میں آیا ہوا تھا۔ اور بڑی دیر تک کتنی ہی بڑی بڑی، لمبی چوڑی باتیں کرتا رہا۔ جیسے امی کو لیکچر دے رہا ہو اور امی سر جھکائے دھیرے دھیرے روتی رہی تھی۔ اور مجھے جمعہ پہ بڑا غصہ آتا رہا تھا۔ ہنہ! میری پیاری امی کو رُلا رہا تھا۔ تمھیں، جھوٹا، دھوکہ باز اور مکار کہہ رہا تھا ــــــــــ بڑا آیا سچ کہیں کا۔ اور ایک بار تو ابا! بولتے بولتے اتنا تیز ہو گیا تھا کہ میرے سرہانے رکھے ہوئے رسالے اور تمھاری کتابیں اُٹھا لایا تھا۔ اور کہنے لگا ــــــــــ آگ میں جھونک دو انہیں۔ ان نظموں کو ان کہانیوں کو۔ جگیش بابو نے ہمارے لئے لکھی تھیں۔ ہماری بھوک مٹانے کے لئے لکھی تھیں۔ اور جنھیں سرکار نے ضبط بھی کر لیا تھا۔ اب یہ ہمارے کس کام کی۔ جب ان کا لکھنے والا ہی ہمارا نہ رہا۔ تو ہم انھیں پڑھ کر کیا کریں۔

اُف! کتنا خوفناک اور ڈراؤنا چہرہ ہو گیا تھا جمعہ کا۔ یہ جمعہ ہمارا کیا لگتا ہے ابا۔ ہمارے گھر میں آکر ہمیں گالیاں سُناتا رہتا ہے۔ اگر پھر کبھی آیا تو میں دروازہ بند کر دوں گا۔ اور اسے اندر بھی نہیں گھُسنے دوں گا۔

میں نے شام کو کھانا کھاتے کھاتے امی سے بھی پوچھا تھا کہ یہ جمعہ ہمارا کیا لگتا ہے ؟ مگر امی تو بس رونے کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ مجھے گلے سے چمٹا کر میرا ماتھا زور زور سے چومنے لگتی ہے —— کہتی تھی جمعہ سچ کہتا ہے بیٹے! سرکار کے ہاتھ میں دھن ہے اور تمہارے ابا کو ہمارے لئے دھن کی ضرورت۔ لیکن جمعہ کو تمہارے باپو جی کی نظموں کی ضرورت ہے۔ اور سرکار تمہارے ابا کو ایسی نظمیں لکھنے ہی نہیں دیتی۔ جو وہ جمعہ کے لئے لکھتا ہے پھر وہ کیا کرے، جمعہ کیا کرے —— مجھے امی کہتی تھی کہ تم بھی اپنے ابا کو ایک زوردار خط لکھو کہ وہ ہماری فکر نہ کریں۔ میں چکی پیس کر، میں مشین چلا کر اپنا پیٹ بھر لوں گی۔ وہ سرکار کے لئے نظمیں مت لکھیں۔ بیٹا! تمہارے ابا سرکار کے لئے نظمیں لکھیں گے تو وہ ضرور پاگل ہو جائیں گے، ان کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ بیمار ہو جائیں گے۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ وہ کچھ بھی نہ لکھیں اور کوئی پان سگرٹ کی دکان کھول لیں۔

ابا! امی کی باتیں مجھے زہر کی طرح لگیں اور میں نے روٹی کھانا بھی چھوڑ دی۔ اور اٹھ کر باہر بھاگ گیا۔ اُف! میں کیا کیا سپنے دیکھا کرتا تھا کہ تم نوکری کرو گے تو میں بھی مادھو اور گردھاری کی طرح عیش اڑایا کروں گا۔ ایک ننھی سی سائیکل خرید وں گا۔ نئے نئے کپڑے سلواؤں گا۔ اچھا کھانا بھی ملے گا۔ مگر یہ جمعہ اور یہ امی! ان کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میری مانو تو ابا! تم نوکری ضرور کر لو۔ آخر حرج ہی کیا ہے۔ تم سرکار کے لئے بھی لکھا کرو اور کبھی کبھی جمعہ کے لئے بھی نظمیں لکھ دیا کرو۔ یہ چالاکی مجھے ابھی ابھی سوجھی

ہے۔ امید ہے کہ تم بھی میری اس دانائی کی داد دوگے۔

اچھا! اب میں سونے لگا ہوں ——— ہاں کل تمہارے نام ایک بڑا سا لفافہ آیا تھا۔ تمہاری کوئی کہانی تھی۔ شاید ریڈیو والوں نے واپس کر دی ہے۔ لکھا تھا کہ ہم یہ کہانی نہیں خرید سکتے۔ کیونکہ یہ سرکار کی پالیسی کے خلاف ہے۔ میں وہ لفافہ بھی تمہیں بھیج رہا ہوں۔

تمہارا پیارا بیٹا

رانا کوشل کاہنی

سویرا

خاص نمبر

کرشن چندر

مہالکشمی کا پُل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار لکشمی جی کا ایک مندر ہے اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں۔ جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدررو ہے۔ جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دُھلتی ہے اور بدررو میں انسان کے جسم کی غلاظت، اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پُل ہے۔

مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پُل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے اس پار جاتے ہوئے لوگ مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ، گاڑی کی کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ، اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں، وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں، بھورا، گہرا بھورا۔ مٹ میلا نیلا۔ قرمزی بھورا۔ گندا سرخ کنارہ۔ گہرا نیلا اور لال، وہ لوگ

اکثر انھیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں، ایک لمحے کے لئے۔ دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گذر جاتی ہے۔

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذبِ نظر نہیں رہے۔ کسی زمانے میں ممکن ہے جب یہ نئی خریدی گئی ہوں ان کے رنگ خوبصورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر اب نہیں ہیں۔ دھوئے جانے سے ان کی آب و تاب مر چکی ہے۔ اور اب یہ ساڑھیاں، اپنے پھیکے سیٹھے روزمرہ کے انداز کو لئے بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انھیں سو بار دیکھئے یہ آپ کو کبھی خوبصورت دکھائی نہ دیں گی۔ نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے، نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں رفو بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں اُدھڑے ہوئے ٹانکے ہیں کہیں بدنما چتلے داغ۔ جو اس قدر پائدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دُھلتے بلکہ اور گہرے ہو جاتے ہیں۔

میں ان ساڑھیوں کی زندگی سے واقف ہوں۔ کیوں کہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے، بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں۔ اس لئے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔۔ ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے۔ اس لئے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سُن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔

اِدھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی۔ مگر

وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں میں اس کا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں، کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے جیسا شانتا بائی کی ساڑھی کا! اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں گے پیں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیون بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس کی ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجنے کا کام کرتی ہے اس کے تین بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے۔ دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند سیون مل میں کپڑ کھاتہ میں کام کرتا ہے اسے بہت جلد جانا ہوتا ہے اس لئے شانتا بائی اپنے خاوند کے لئے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا کے رکھتی ہے، کیونکہ اسے صبح خود برتن صاف کرنے کے لئے اور پانی ڈھونے کے لئے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے اور اب وہ ساتھ میں اپنی چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے۔ اور دوپہر کے قریب واپس چال میں آتی ہے۔ واپس آکے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑھی دھوتی ہے اور سکھانے کے لئے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانے پکانے میں لگ جاتی ہے۔ شانتا بائی کے گھر چولھا اسی وقت سلگ سکتا ہے جب دوسروں کے ہاں چولھے ٹھنڈے ہو جائیں۔ یعنے دوپہر کو دو بجے

اور رات کو نو بجے۔ ان اوقات کے اِدھر اور اُدھر اسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے۔ چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں اس دن شانتا بھی میری نمستے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھنتی بڑبڑاتی چولھا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے اور چولھے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھویں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا ہے اور راسے اکثر بھوک لگی رہتی ہے اور دو سال ہی کی عمر میں اسے باجرے کی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ اسے اپنی ماں کا دودھ دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے پھر یہ بھی خشک باجرے اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جاگتے میں بھی بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجرہ اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرتے جاتے ہیں اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانہ کا رُخ کرتے ہیں تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لئے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ ایک دن پئے گا دو دن پئے گا۔ تیسرے دن کی

تارڈی کے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے۔ راشن کا خرچہ ہے بھاجی ترکاری ہے، تیل اور نمک ہے، بجلی اور پانی ہے اور شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ جبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدری نکمی ساڑھی دیتے ہیں ان کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے جوڑ کے گانٹھ کے ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے اور پھر وہی چار روپے پانچ آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آ جاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے اس لئے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھر والیں جھاڑو دینا ہوتی ہے۔ برتن صاف کرنا ہوتے ہیں۔ تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے وہ بھورا رنگ پسند نہیں کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی۔ اونہہ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے۔ پہنے تھے۔ انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا۔ جب وہ دھارا دار میں اپنے گاؤں میں تھی۔ جب اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی۔ جہاں میلوں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے۔ جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے، ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت۔ اور آنگن میں بیر کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ بیر توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی۔ جانے اب بیروں میں وہ مزا ہی نہیں ہے۔ وہ شیرینی اور گھٹا دسٹ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ وہ چمک دمک جانے کہاں جا کے مر گئی۔ وہ سارے رنگ کیوں یکلخت بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجھتے، کھانا پکاتے، اپنی

ساڑھی دھوتے، اُسے پل کے جنگلے پر لاکر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹڑی پر بہتے جاتے ہیں اور دور سے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گذر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے بھورے رنگ کی ہے بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے پھیکا نظر آئے گا لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ ساڑھی بھی پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں اور اتنی دور سے معلوم بھی نہیں ہوتے۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی لگا یا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس سے پہلی ساڑھی کا ہے اور دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے اس لئے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اس خاوند کے لئے روتی رہتی ہے جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی آنکھ کانی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لئے نشے میں تھا کہ وہ اس روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈو۔ اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے منھے ریشے اس کے پھیپھڑوں

میں جاکے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور اینٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس کر لگ جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اسے دمے میں مبتلا کر دیتے اور جب برسات نہ ہوتی تو دن بھر اور رات بھر کھانسی ایک خشک مسلسل کھنکار گھر میں اور کارخانہ میں جہاں وہ کام کرتا تھا، سُنائی دیتی رہتی۔ مل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا اگر غصے میں آ کے ایک دن اس نے جیونا بائی کی آنکھ نکال دی۔ تیس سال کی ازدواجی زندگی ایک لمحے پر قربان نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی۔ ڈھونڈو ایسا نہ تھا اسے اپنی بے کاری کا غم تھا۔ اپنی پینتیس سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا رنج تھا اور سب سے بڑا رنج اسے اس بات کا تھا کہ مل مالک نے اسے چلتے وقت ایک دھیلہ بھی نہ دیا۔

پینتیس سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آکر اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان پینتیس سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، اس کا سارا خون، اس کا سارا رس چوس لیا ہو اور اسے بے کار سمجھ کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس کی اونچی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکایک ڈھونڈو نے غم اور غصے سے اپنے ہاتھ ملے۔ زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانہ میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ پھر بھی نہ جاتی اگر اس کے پاس علاج کے لئے پیسے ہوتے وہ آنکھ تو گل گل کر سڑ سڑ کر خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں اور کمپونڈروں اور نرسوں کی بد احتیاطیوں، گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہو گئی اور جب جیونا اچھی ہوئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اُٹھ سکا۔ ان دنوں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجنے کا کام دلوا دیا تھا اور گو وہ اب بوڑھی ہو گئی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔

لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی خیریت اسی میں تھی کہ وہ بالکل اکیلی تھی اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا، بھڑکیلا ریشمی لباس پہنے بیٹھی ہے۔ لیکن جیونا کو یقین نہ آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ اس کا اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے

والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی۔ یہ سب چھوڑ کے نارس رو ڈکیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کر لے گیا تھا۔ کیونکہ عورت محبت کے لئے سب کچھ کر گذرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لئے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کے نہیں چلی آئی تھی۔ ہاں جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش جلانے کے لئے لے جانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کر رکھی تھی۔ عین اسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور اسے دیکھ کر جیونا کو یقین آ گیا کہ جیسے اس کا سب کچھ مر گیا ہے۔ اس کا پتی، اس کی بیٹی، اس کی عزت۔ جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے ننھا، ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو اسی لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں زندگی بھر اس کا خاوند کام کرتا رہا اور وہ جگہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہو گئی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی دوکان سجا کے بیٹھ گئی ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کو لے کے گنے کا رس نکالنے والی چرخی میں ٹھونستا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے اور یکایک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی ہو گئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے۔ یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے۔ اور

مٹیلا بھی ہے۔ کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا بلکہ اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں مجھے پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیون مل اور بکریا مل کے مزدوروں کو یہی تنخواہ ملتی ہے اس لئے میں بھی انھیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں کلرک ہوں۔ میں فورٹ میں نوکر ہوں، میں دسویں پاس ہوں۔ میں ٹائپ کر سکتا ہوں۔ میں انگریزی میں عرضی لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیرِ اعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج ان کی گاڑی تھوڑی دیر میں مہالکشمی پر آئے گی نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیرِ اعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔ مگر میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت ایک پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے۔ راشن تو روز کم پڑ جاتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات کو سونے کے لئے جگہ بھی کم پڑتی ہے اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینے میں صرف پندرہ دن چلتی ہے باقی پندرہ دن سود خوار پٹھان چلاتا ہے اور وہ بھی کیسے گالیاں بکتے جھکتے گھسیٹ گھسیٹ کسی سست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں۔ مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس ان کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا اور ساوتری کو اپنے گھر یعنی اس کھولی میں لایا تھا تو میں نے بہت کچھ سوچا تھا ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی۔ گوبھی کے نازک نازک ہرے ہرے پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں

جب وہ مسکراتی تھی سینما کی تصویر کی طرح خوبصورت دکھا کرتی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں کیسے بھی کہوں، کتنی ہی لجاجت سے کہوں وہ تو بس کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سہتا ہوں اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے۔ شاید اسے ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے۔ مگر اب ان باتوں کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آگئی ہے اور ہمارے وزیرِ اعظم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنے ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مِل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیرِ اعظم کی تقریر جو اخبار میں چھپی تھی سنائی تو وہ اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے غصے میں آکے چولھے کے قریب پڑا ہوا ایک چمٹا میرے سر پہ دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں اسی کا نشان ہے۔ ساوتری کی مٹ میلی نیلی ساڑھی پر بھی ایسے کئی زخموں کے نشان ہیں مگر آپ انھیں نہیں دیکھ سکیں گے میں دیکھ سکتا ہوں ان میں سے ایک نشان تو اسی مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی کا ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک بھنجی مل بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اُس کھلونے کا ہے جو پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ لیکن جسے ہم خرید نہ سکے اور جسے نہ پاکر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا جس میں

ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود بھی کسی سے مجھے روپے ادھار نہ مل سکے اور ساوتری جبل پور نہ جا سکی ایک نشان اس تار کا ہے جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان ..... مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں۔ ان چپٹے چپٹے گدلے گدلے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھی بھری پڑی ہے۔ روز روز دھونے پر بھی یہ داغ نہیں چھوٹتے اور شاید جب تک یہ زندگی رہے گی یہ داغ یوں ہی رہیں گے۔ ایک ساڑھی سے دوسری ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑھیاں ہیں۔ لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے، جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے، جیسے یہ سب کبھی زمین سے اونچی نہیں اٹھیں، جیسے انھوں نے کبھی شبنم میں ہنستی ہوئی دھنک، افق پر چمکتی ہوئی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی۔ جیسے جو شانتا بائی کی جوانی ہے وہ جیونا کا بڑھاپا ہے وہ ساوتری کا ادھیڑپن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑھیاں، زندگیاں، ایک رنگ، ایک سطح، ایک تواتر ایک تسلسل، یکسانیت لئے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جھبّو بھیّئے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی۔ کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ

نہیں ہے اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہ ہو بڑی نحس ہوتی ہے اور جادو ٹونہ کر کے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے اور بدروحوں کو بلا کر اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبو بھیا مراد آباد کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کر ادھر چلا آیا تھا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے اسی وجہ سے اسے بہت جلد پوار مل کے گٹی کھاتہ میں جگہ مل گئی تھی۔ جھبو بھیا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا اسے بیڑی کا، تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستر اسی روپے اکٹھے ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تاکہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے مگر پھر اس نے سوچا کہ ان ستر اسی روپیوں میں کیا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی لیکن اس رقم سے وہ مراد آباد جا سکتا تھا، جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ آخر جھبو بھیا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپیہ میں خرید لیا۔ اسی روپے اس نے نقد دیئے۔ بیس روپے ادھار میں رہے، جو اس نے ایک سال کے عرصہ میں ادا کر دیئے۔ بعد میں جھبو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی۔ دھیرج گاؤں کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبو بڑا خوش ہوا۔ چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی جات برادری کی۔ اپنے ضلع کی۔ اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سو روپے میں مل گئی۔ اس نے بڑے ہاؤ چاؤ سے اپنا بیاہ رچایا اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں

زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لڑیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبو اور لڑیا دونوں گاتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا اس لئے انھوں نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ میاں مٹھو خاوند اور بیوی کو گاتے دیکھ کر خود بھی لہک لہک کر گانے لگتے۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبو نہ بیڑی پئے نہ سگریٹ، تاڑی نہ شراب۔ لڑیا بیڑی سگریٹ تاڑی سبھی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر جب سے وہ بدمعاشوں کے پلے پڑی اسے یہ سب باتیں سیکھنا پڑیں۔ اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے لیکن بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر لڑیا نے جھبو پر حملہ کیا اور جھبو نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر طوطا بہت شور مچاتا تھا۔ وہ رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چلانے لگتا۔ لڑیا کو مت مارو مادرچود۔ لڑیا کو مت مارو مادرچود۔ ایک بار تو اس کی گالی سن کر جھبو غصے میں آ کے طوطے کو پنجرے سمیت بدررو میں پھینکنے لگا تھا مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کے طوطے کو بچا لیا۔ طوطے کو مارنا بڑا پاپ ہے۔ جیونا نے کہا تمھیں پھر براہمنوں کو بلا کے پراشچت کرنا پڑے گا اور تمھارے پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبو نے طوطے کو بدررو میں غرق کر دینے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبو کو ایسی شادی پہ چاروں طرف سے

گالیاں پڑیں۔ وہ خود بھی لڑیا کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا اور کئی بار بلاوجہ اسے پیٹا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی تھی کہ کوئی عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلّے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے، چاہے وہ چھوٹا ہی سا گھر ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو۔ چاہے وہ جھبو بھیا ایسا ہر وقت شور مچانے والا، زبان دراز، شیخی خور اہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو۔ اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا اور جھبو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا۔ ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پنجرا جھلا رہی تھی اور اسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی جو فضا میں ہمکتا ہمکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا اور اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبو کو اٹھائے چلے آرہے ہیں اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا ــــ وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی اور اس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کے اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبو سے گنتی کھلنے کے مینیجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی، اس پر جھبو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دئیے اس پر بہت واویلا مچا اور مینیجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کے جھبو کی خوب ٹھکائی کی اور اسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبو بچ گیا ورنہ اس کے مرنے میں

کوئی کسر نہ تھی۔ لڑیا نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پہ ٹوکری اٹھالی اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی تھی۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے جھبو کو اچھا کر لیا۔ جھبو اب بھلا چنگا ہے مگر اب اسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کے سٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے، سیون مل۔ نیو مل۔ لالڈ مل۔ پوار مل۔ دھن راج مل۔ لیکن اس کے لئے کسی مل میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور کو گالی کھانے کا حق ہے۔ گالی دینے کا حق نہیں ہے آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس نے بیڑی تاڑی سب چھوڑ دی ہے۔ ہاں اس کی ساڑھی قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبو کو کام نہیں ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑھی پر پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلانا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑھی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ ساڑھی کا رنگ گدلا سرخ ہے لیکن کنارہ گہرا نیلا ہے اور اس گہرے نیلے رنگ میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑھی، دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے کیونکہ یہ ساڑھی، پانچ روپے چار آنے کی نہیں ہے۔ اس کا کپڑا اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بہتر ہے اس کا کنارہ چمکدار ہے۔ اس کی قیمت پونے نو روپے ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں

ہوئے ہیں۔ اس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آ کے مارا گیا تھا۔ اور اب سولہ برس کی خوبصورت منجولا بیوہ ہے۔ اس کا دل جوان ہے۔ اس کا جسم جوان ہے۔ اس کی امنگیں جوان ہیں۔ لیکن وہ اب کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مر گیا ہے۔ وہ پٹہ بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھیٹھتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا کیونکہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لئے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹے کو تبدیل کرنے کے لئے روپیہ بھی خرچ ہوتا تھا۔ مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے اس کے لئے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی جو نامنظور ہوئی کیونکہ منجولا کا خاوند اپنی غفلت سے مرا تھا اس لئے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا۔ اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑھی پہنے رہی۔ جو اس کے خاوند نے پونے نو روپے میں اس کے لئے خرید کی تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مر جانے کے بعد بھی دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی اور جو ساڑھی تھی وہی گدلے سرخ رنگ کی پونے نو روپے کی ساڑھی جس کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھی پہنے گی۔ اس کا خاوند زندہ رہتا جب بھی وہ دوسری ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی لاتی۔ اس لحاظ سے

اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے، ایک سفید ساڑھی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں بیوہ معلوم ہو سکے۔ یہ ساڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ اس ساڑھی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی مضبوط باہیں لپٹی ہوئی ہیں جیسے اس کے ہر تار پر اس کے شفاف بوسے مرتسم ہیں۔ جیسے اس کے تانے بانے میں اس کے خاوند کی گرم سانسوں کی حدت آمیز غنودگی ہے۔ اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے اب یہ ساڑھی نہیں ہے۔ ایک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو ہر وقت وہ اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے پہ مجبور ہے۔ جیتی جاگتی زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے۔ لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس کی پہننے والی مر چکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے روز کی طرح دھلی دھلائی، ہوا میں جھول رہی ہے۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا سیتو۔ وہ اب جیل میں ہے۔ ہاں سیتو کی بیوی اور اس کا لڑکا ابھی نیچے آنگن میں دروازے کے قریب پڑے رہتے ہیں۔ سیتو، سیتو کی بیوی ان کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لئے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لئے اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا جتنا ہم لوگوں کو ملتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں۔ وہیں کھانا پکا لیتے ہیں۔ زمین پر پڑ کے سو رہتے ہیں

یہیں پر بڑھیا مائی بھی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں، پلّو کے قریب یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کی ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ نہیں وہ اس ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ وہ بیچاری تو بہت بوڑھی تھی۔ چل پھر بھی نہیں سکتی تھی اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے۔ یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے۔ یعنے اپنی زندگی کے لئے دو وقت کا روٹی کپڑا اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے۔

لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دیدی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے آگے تھا اور خوب زور وشور سے نعرے لگاتا تھا۔ پھر جب جلوس بھی خلافِ قانون قرار دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی۔ ہم لوگوں نے تو اپنے دروازے بند کر لئے۔ لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا۔ اور پھر ہمیں اپنے کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی ادھر سے اُدھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد بالکل سنّاٹا ہوگیا اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا اور ہماری چال کے قریب بڑھیا مری پڑی تھی۔ یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے، جس کا بیٹا سیتو اب جیل میں ہے۔ اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہیئے تھا۔ مگر کیا کیا جائے۔ تن ڈھکنا

زیادہ ضروری ہے۔ مردوں کی عزت و احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑھی چلنے چلانے کے لیے نہیں ہے۔ تن ڈھکنے کے لئے ہے۔ ہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے۔ کیونکہ اس میں پچھلے اسی برسوں کے سارے آنسو اور ساری امنگیں اور ساری فتحیں اور شکستیں جذب ہیں۔ آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اسی ہمت سے کام کرنے لگتی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ نہیں گولی نہیں چلی۔ کوئی جیل نہیں گیا۔ بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چل رہی ہے۔

سلے لو باتوں باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لیے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لئے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہا لکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ یہ چھ ساڑھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں۔ ایسی معمولی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں۔ جہاں ایک کونے میں چولہا سلگتا ہے۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ اوپری طاقچہ میں شیشہ ہے۔ کنگھی ہے، سیندور کی ڈبیا ہے۔ کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنھیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں۔ ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں۔ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیر اعظم صاحب! یہ ہوا میں

جھولتی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا ملک۔ کوئی بڑا عہدہ۔ کوئی بڑی موٹر کا کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی، یہ ایسی کسی چیز کی طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھئے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے، جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے لئے اسکول کی فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمتی ہے۔ یہ بڈھی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کے پھالے میں تبدیل کر دینا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اٹھے اور گندم کے خوشے بن کر لہرانے لگے........

لیکن وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نہیں رکی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے کے چوپاٹی پر چلے گئے۔ اس لئے میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی ادھر سے گذرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھئے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹکی ہوئی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمی ساڑھیوں کو دیکھئے جنہیں دھوبیوں نے اس پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا رکھا ہے اور جو ان گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہیں پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف ضرور دیکھئے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھئے میں آپ سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی کے پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف؟

شاہراہ
نمبر ۱

کنہیا لال کپور

شن شن شان

ملک شن شن شان (جسے کئی لوگ شن شنگ شان بھی کہتے ہیں) کو آزاد ہوئے اب لگ بھگ بارہ سال ہو چکے تھے۔ لیکن اس بارہ برس کے عرصے میں اس کے سوا کہ ملک آزاد ہو گیا تھا اور کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ زمین پہلے کی نسبت سخت تر تھی اور آسمان دور تر۔ یہ درست ہے کہ جب ملک آزاد ہوا تھا تو شن شن شانی جھنڈے لہرائے گئے تھے۔ شن شنگ شانی ترانے گائے گئے تھے لیکن وہ تو اب ماضی بعید کی بات تھی۔ ملک کا جو حال اس وقت تھا اس کے پیش نظر بہت کم صحیح العقل انسان یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ واقعی آزاد ہیں۔ البتہ عوام جنھیں ہر صدی اور ہر ملک میں جُل دیا گیا ہے۔ لیڈروں کے بار بار یقین دلانے پر یہ ماننے کے لئے تیار ہو گئے تھے کہ انھوں نے غلامی کا جُوا اتار پھینکا ہے۔ ان میں سے بھی بعضوں کا ایمان کبھی کبھی متزلزل ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ کسی مقامی رہنما کی کوٹھی پر جاتے اور اس سے کہتے۔ "حضور ہمیں بتائیے، کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟ کیا واقعی — ہمیں یقین دلا دیجئے۔ ایک بار پھر یقین دلا دیجئے حضور!"

اس پر وہ گھبرا کر ان کی طرف دیکھتا اور ایک ساعت کے لئے نگاہیں نیچی کر لیتا

اس کی نگاہ اپنے کمخواب کے چغے پہ پڑتی ۔ پھر وہ نگاہ اُٹھا کر کمرے میں پڑے ہوئے قیمتی سامان کا جائزہ لیتا اس کی آنکھ میں ایک چمک لہرانے لگتی "ہاں ہاں ہم آزاد ہیں، بالکل آزاد یقین کیجیے، مجھ پہ یقین کیجیے ۔ کیا یہ کافی ثبوت نہیں کہ ہم یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں ۔ آپ سب میرے پاس بیٹھے ہیں ۔ اور، اور میں آپ کا خادم ہوں" وہ عوام کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے نظر چرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا "یقین جانو"

ملک کے آزاد ہونے کے بعد ملک میں ایک زبردست طوفان آیا تھا جس کی تمام ذمہ داری عوام نے قومی بازیگروں سے اور قومی بازیگروں نے عوام سے منسوب کی تھی ۔ لیکن سوخرالذکر نے اعلان کر دیا تھا کہ ایک معمولی حادثے کو زبردست طوفان کا نام دینا مبالغہ آمیزی کی انتہا ہے ۔

شن شن شان کے آزاد ہونے کے بعد راہنماؤں کی سب سے بڑی "ایجاد" ایک تکیہ کلام تھا ۔ جسے وہ ہر موقعہ پہ استعمال کر کے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیتے تھے ۔ وہ تکیہ کلام تھا "الہ دین کا چراغ" یہ تکیہ کلام واقعی بڑے کام کی چیز تھا کیونکہ مشکل لمحوں میں ہمیشہ آڑے آتا تھا ۔

عوام پکارتے "حضور ہمیں روٹی نہیں ملتی" تو جواب ملتا "کیا ہمارے پاس الہ دین کا چراغ ہے کہ ہم آپ کو چشم زدن میں روٹی مہیا کر دیں"

"حضور! کپڑا نہیں ملتا"

"انتظار کیجیے ۔ ہمارے پاس الہ دین کا چراغ نہیں کہ راتوں رات کپڑا تیار کرنے کا کارخانہ لگا دیں"

"جناب نمک نہیں ملتا"

"نمک کے بغیر گذارہ کیجئے۔ آخر ہمارے پاس الہ دین کا چراغ تو نہیں کہ جو آپ کو...."

جب سے ملک آزاد ہوا تھا ارباب حکومت نے کام کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ نکالا تھا یعنی عوام کو کھلی اجازت دیدی تھی کہ اپنی ہر شکایت مقامی افسروں کے گوش گذار کریں وہ اس شکایت کو غور سے سُنیں گے اور اپنی رپورٹ اعلیٰ افسروں کے پاس بھیجدیں گے جو اس رپورٹ کو نہایت غور سے پڑھیں گے۔ اور اس پر اپنے دستخط کرکے جناب وزیر اعظم کی خدمت میں ارسال کریں گے۔ وزیر اعظم صاحب فائل کا بغور مطالعہ کرینگے اور بغور مطالعہ کرتے رہیں گے اور پھر کسی فرصت کے لمحے میں اس کام سے متعلق ایک کمیٹی مقرر کریں گے اور ممبرانِ کمیٹی کو یہ حق عطا فرمائیں گے کہ وہ عوام کی شکایات پر غور کریں اور غور کرتے رہیں۔ چاہے اس وقت تک غور کرتے رہیں جس وقت تک کہ وہ شکایات خود بخود رفع ہو جائیں۔ ایک دفعہ ایک شہر میں لوگوں کو پانی کی کمی محسوس ہوئی اور پیاس کی شدت سے بے حال ہونے لگے۔ حکومت نے ایک پانی کمیٹی مقرر کی جو چھ مہینے کی مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ پانی تو بے حد عام چیز ہے اور قدرت کی اُن نعمتوں میں سے ہے جو مفت ہر خاص و عام کے حصے میں آتی ہیں۔ جسے قدرت نے بہم پہنچانے کے وسیع انتظامات کر رکھے ہیں۔ پانی کی کمیابی کی شکایت کا تعلق قدرت سے ہے۔ حکومت سے نہیں بلکہ ایسی شکایت حقیقتاً قادرِ مطلق کی توہین کے مترادف ہے۔ ویسے تو حکومت پانی کا انتظام فی الفور کر سکتی ہے کیونکہ چشمہ ویری ناگ سے پانی لانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ مگر ایسا انتظام کرنا بے کار ہے۔ چونکہ وہ تمام لوگ جو پانی پانی پکارتے تھے اب اس دنیائے آب و گل میں نہیں رہے۔ اس لئے کاغذات فائل کر دیئے جائیں۔

ملک کے آزاد ہوتے ہی قومی رہنماؤں نے رفاہ خلائق کے لئے بڑے بڑے
پروجیکٹ تیار کر لئے تھے۔ یہ پروجیکٹ دودھ اور شہد کی نہریں چلانا، ہر مرد کے لئے
بیوی مہیا کرنا، غریبوں کے لئے شیش محل بنانا اور اس قسم کی دیگر تجاویز پر مشتمل تھے
لیکن اتنی جلدی یہ پروجیکٹ کیسے شرمندۂ تکمیل ہو سکتے تھے۔ ارباب بست وکشاد
کے ہاتھ میں الہٰ دین کا چراغ تو نہ تھا۔
لیکن ٹھہریئے اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ چراغ وہی چراغ ہے جو کہ
پردۂ سیمیں پر دکھایا جاتا ہے۔ اور جس کے رگڑنے سے وہ حسد سے جلی بھنی حسینہ آموجود
ہوتی ہے۔ ایسے چراغ تو شاید ہوں۔ الہٰ دین کا جن والا چراغ تو نہیں تھا۔
الہٰ دین کا چراغ نہ ہونے کی وجہ سے عوام مایوس ہونے لگے۔ لیکن رہنماؤں
کو اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ انھیں یقین تھا کہ چند دن کے اندر اندر ہی وہ
ملک کی کایا پلٹنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

رفتہ رفتہ ملک سے ہر وہ چیز غائب ہونے لگی جس کے بغیر زندگی ناممکن ہے، چاول
کھانڈ، سگریٹ، نمک عوام نے مقامی افسروں سے شکایت کی کہ کوئی چیز کسی قیمت
پر دستیاب نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے حسب معمول اس حادثہ کی اطلاع حکام بالا کو
پہنچا دی۔ حکام بالا نے وزیراعظم کو مطلع کیا اور وزیراعظم نے ایک مختصر تار میں عوام
کو تلقین کی کہ "اگر کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو عوام کو غم ملت کھانا چاہیئے"۔
چند سال عوام غم ملت کھاتے رہے۔ لیکن جب اس سے شکم پری نہ ہوئی۔ تو
انھوں نے پرائم منسٹر کو لکھ بھیجا "حضور ہم غم ملت کھا کھا کر تنگ آ گئے ہیں کوئی دوسری

چیز بھیجئے۔"

پرائم منسٹر نے جواب لکھا۔"خاکسار اس معاملہ میں مجبور ہے آپ شہنشاہ شن شن شان سے براہ راست خط وکتابت کیجئے۔"

چنانچہ عوام نے شہنشاہ شن شن شان کی خدمت میں ایک درخواست خون کے آنسوؤں سے لکھ کر گذاری۔ شہنشاہ شن شن شان نے اس درخواست کو پڑھنے کے بعد حکم صادر کیا کہ وہ نفس نفیس آزادی کی بارہویں سالگرہ پہ عوام سے خطاب کریں گے بارے آزادی کی بارہویں سالگرہ آئی اور شن شن شان کے دارالخلافے میں حضور شہنشاہ نے بیس لاکھ کے مجمع میں جو ملک کی آبادی کا نوے فی صد حصہ تھا۔ ایک نہایت مدلل تقریر کی۔"حضرات! آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بھوکوں مر رہے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ آپ کا وہم ہے آپ کو ضرور کسی شخص نے بہکایا ہے ورنہ آپ کو یہ وہم لاحق نہ ہوتا۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے بارہ سال کے عرصے میں آپ کے لئے کیا کیا۔ آپ سخت ناشکرے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس مختصر وقت میں میں نے آپ کی بہبودی کے لئے کم از کم بارہ ہزار اسکیمیں تیار کی ہیں جن میں سے چند پہ مستقبل قریب میں عمل بھی کیا جائے گا۔

میری طرف دیکھئے! کیا میں نے صرف آپ کی خدمت کے لئے اس عہدے کی مصیبت اپنے سر نہیں لی۔ مجھے چھوڑ یئے۔ میں نے اپنے پانچ درجن عزیزوں پہ صرف اس لئے بڑے بڑے عہدوں کی مصیبت ڈال رکھی ہے کہ وہ صبح شام آپ کی بہتری کے لئے پراجیکٹ تیار کرتے رہیں۔ کیا ہم آپ کے مفاد کے لئے قربانی کے بکرے نہیں بنے؟ بولو!

شاید یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے حکومت کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا یہ الزام بھی بہت حد تک درست ہے۔ حضرات! میں نے ساری عمر جیل خانے یا قوم کے لئے جوشیلے نعرے ایجاد کرنے میں گذاری۔ ان حالات میں آپ مجھ سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ آخر میرے پاس الہ دین کا چراغ تو ہے نہیں کہ راتوں رات ایک قابل رشک حکمران بن جاؤں آپ مجھ پر اعتماد رکھیئے انشاء اللہ آئندہ پانچ برس میں آپ کو ایک لائق قدر شہنشاہ بن کر دکھاؤں گا۔ بشرطیکہ اس عرصے میں آپ کسی کے بہکائے پر بھوکوں نہ مر گئے۔ حضرات، بارہ سال کا عرصہ قوموں کی زندگی میں ایک لمحے سے بھی کم وقعت رکھتا ہے آپ کو اتنی جلدی مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے تھا۔ آپ کہتے ہیں آپ کو گیہوں نہیں ملتا۔ گیہوں نہیں ملتا تو جو کھائیے جو نہیں ملتے؟ باجرہ کھائیے۔ باجرہ نہیں ملتا۔ فاقہ کیجئے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ مسلسل فاقوں کی وجہ سے مر جائیں گے لیکن حضرات میری دانست میں قوم کے لئے جینے سے قوم کے لئے مر جانا کہیں افضل ہے۔ آپ اپنی دو کروڑ سالہ تاریخ پر نظر دوڑائیے۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کا جائزہ لیجئے۔ اپنی روایات کا مطالعہ کیجئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ فاقہ مستی ہمارا سب سے بڑا اور سب سے قیمتی ورثہ ہے (تالیاں)

مجھے افسوس ہے کہ مجھے خود بہترین سامان اکل و شرب میسر ہیں۔ اس لئے میں اس سعادت سے محروم ہوں کہ جو ہمارا قومی سرمایہ ہے۔ لیکن حضرات! آپ کتنے خوش نصیب ہیں کہ آپ قوم کے لئے فاقہ کشی کر رہے ہیں۔ آنے والی نسلیں بشرطیکہ وہ زندہ رہیں آپ پر رشک کریں گی اور مستقبل کا مورخ اگر واقعی کوئی مستقبل کا مورخ ہوا، آپ کی قربانیوں کا ذکر سنہرے الفاظ میں لکھے گا۔ آپ فاقہ کشی کا نیا معیار قائم کر رہے ہیں۔ کیونکہ

ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں بھوکے مر رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھیئے آپ کی فاقہ مستی ایک دن ضرور رنگ لاکر رہے گی۔ اس بات کا مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا اس امر کا کہ مجھ سے بہتر آپ کو کوئی دوسرا شہنشاہ نہیں مل سکتا۔ حضرات! آپ کو اپنے فرائض پہچاننے چاہئیں۔ مدت ہوئی میں نے اپنی ایک تقریر میں آپ کے فرائض ان الفاظ میں متعین کئے تھے کہ آپ کو ہر حالت میں قوم و ملک کی خاطر مرنا ہے۔ تاکہ آپ کا عزیز وطن شن شن شان اور آپ کا عزیز تر شہنشاہ زندہ رہ سکے۔ میں اس لئے اور زیادہ نہیں کہوں گا کیونکہ اس وقت مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ اور میرا خانساماں میرا انتظار کر رہا ہے۔

خیر! میں وہ بات تو ہرگز نہیں کروں گا کہ آپ روٹی مانگنے آئیں اور میں آپ کو کھانے کے لئے پتھر پیش کروں۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ مجھے فی الحال الہ دین کا چراغ دستیاب نہیں ہوا جس کی مدد سے میں بیس لاکھ بھوکے انسانوں کے لئے پتھر کی مطلوبہ مقدار کا انتظام کر سکوں۔ لیکن میں نے آپ کو پتھر سے بہتر چیز دی ہے۔ میرا مطلب ہے یہ تقریر۔ آپ اب بڑی خوشی سے اپنے گھروں کو واپس جا سکتے ہیں۔ ہاں اگر غیر مناسب نہ سمجھیں تو ایک نعرہ شن شن شان زندہ باد لگاتے جائیے۔ اور خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کے شہنشاہ کی عمر دراز کرے اور اسے جلد از جلد الہ دین کا چراغ بہم پہنچائے۔ شب بخیر!"

شن شن شان (جسے کئی لوگ شن ترک شان بھی کہتے ہیں) کے عوام خوشی خوشی گھروں کو لوٹے اور اس رات ہر مندر و مسجد میں دعائیں مانگی گئیں۔ "خداوند کریم یعنی ایشور پرماتما شہنشاہ شن شن شان کو اپنی پہلی فرصت میں الہ دین کا چراغ بہم پہنچائے"

ادب لطیف

مہندر ناتھ

صبح، دوپہر، شام

یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جب کبھی میں اس بازار سے گذرتا ہوں وہ عورت مجھے اس بازار میں چکر کاٹتے ہوئے ضرور ملتی ہے۔ یوں عورتیں دیکھنا کوئی گناہ نہیں خاص کر خوبصورت عورتیں۔ بھلا عورتیں ہی کیوں۔ مرد بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے اور ذہن میں اچھی اچھی چیزیں اُبھرتی ہیں۔ حسین عورتوں کو دیکھکر خوبصورت چیزوں کا خیال آتا ہے۔ مثلاً ریشمی کپڑے، سنہری بال، دھان کے کھیت، ناریل کے درخت کے پیچھے ابھرتا ہوا چاند، دلآویز مسکراہٹ۔ گاتا ہوا آبشار، شرمائی ہوئی آنکھیں نیلا آکاش، پھیلی ہوئی شفق، شانوں پر بکھرے ہوئے بال، ہنستا ہوا چہرہ، معصوم نگاہیں چوڑا چکلا سینہ، عشق اور ہجر و وصال کی باتیں، اور اسی طرح مختلف اقسام کی رنگا رنگ تصویریں ذہن کے پردے پر اُبھر آتی ہیں، اور پل بھر کے لئے ذہن کے تاریک گوشوں کو منور کر جاتی ہے۔ لیکن اس عورت کو دیکھ کر مجھے عجیب قسم کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل جب میں اسے اس حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ عورت نہیں ہے بلکہ کچھ اور شئے ہے عجیب حسرتناک چہرہ لئے ہوئے اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔

ایک دن دوپہر کے وقت مجھے ٹرام کے اڈّے پر دکھائی دی تھی۔ میرا اندازہ ہے
کہ آپ بھی اس بازار میں سے کئی بار گذرے ہوں گے۔ اور شاید آپ کی نگاہ اس عورت
پر پڑی ہو۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ نگاہ نگاہ کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے نہ پڑی ہو، بہر حال
یہ بازار اس شہر کا سب سے بارونق اور مشہور بازار ہے۔ یہاں بڑی بڑی دوکانیں ہیں۔
فلک بوس عمارتیں ہیں۔ اور بڑے بڑے بیوپاریوں کی نفیس اور آراستہ دوکانیں یہاں
دوکاندار اپنی چیزوں کو نمائشی بکسوں میں سجا کر رکھتے ہیں تاکہ گاہک کی نظر ان چیزوں پر
پڑے اور وہ خریدنے پر مجبور ہو جائے۔ میں اس بازار میں صرف اس لئے آتا ہوں کہ ان
خوبصورت چیزوں کو دیکھ سکوں۔ میری جیب میں اتنے روپے نہیں ہوتے کہ ان چیزوں کو
خرید کر پہن سکوں یا ان چیزوں کو خرید کر گھر کو سجا سکوں۔ صرف دل بہلانے کے لئے ادھر
آجاتا ہوں۔ پل بھر کے لئے ٹھہرتا ہوں چھلتی ہوئی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہوں زندگی
میں بہت سی تمنائیں، خواہشیں اور آرزوئیں اسی طرح سینے میں دفن ہو جاتی ہیں۔
اور گھٹ کر مر جاتی ہیں۔ پھر بھی دل بہلانے میں کیا ہرج ہے۔ اگر آپ ادھر سے آئیں
تو دائیں ہاتھ کی جانب، ایک عالیشان عمارت آپ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے گی۔ اس
دوکان کے باہر کے حصے میں بڑے بڑے نمائشی بکس، لگائے گئے ہیں اور مختلف چیزوں
کی بڑی سلیقے سے نمائش کی گئی ہے۔ ایک طرف عورتوں کے پہننے کی چیزیں ہیں۔ اور
دوسری طرف مردوں کے۔ میں دونوں کو دیکھ لیتا ہوں۔ ان چیزوں کی قیمتیں بہت زیادہ
ہیں۔ کم از کم میں تو خریدنے سے رہا۔ باقی رہا آپ کا معاملہ آپ اس دوکان پر جا کر ان
چیزوں کی قیمتیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور اگر بلیک مارکیٹ سے آپ نے روپے کمائے ہیں تو
یقیناً آپ ان چیزوں کو خرید بھی سکتے ہیں۔

توہاں اس روز دھوپ بہت تیز تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور میں بازار میں پیدل جارہا تھا۔ یوں تو اس بازار میں ٹراموں اور بسوں اور کاروں کی گہما گہمی رہتی ہے امیر آدمی کاروں میں سیر کرتے ہیں۔ اور غریب ٹراموں اور بسوں میں۔ اور مجھ ایسے لوگ صرف پیدل چلتے ہیں۔ اس دن مجھے ضروری کام تھا اس لئے تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ جلدی جلدی ان لال پیلے کپڑوں پر نظر پھینکتا ہوا آگے جارہا تھا کہ میں ٹرام کے اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں ٹرامیں آکر رکتی ہیں اور آرام کرتی ہیں۔ مسافر اترتے اور چڑھتے ہیں۔ میں پیدل چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ خیال آیا کہ ٹرام میں بیٹھ جاؤں۔ ٹرام میں بیٹھنے لگا تھا کہ میری نگاہ اس عورت پر پڑی۔ میں نے اس عورت کو دیکھا۔ اور عورت نے میری طرف دیکھا اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس عورت کو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ اس عورت کو دیکھ کر میرے ذہن میں عجیب قسم کے خیالات آئے۔ وہ دیر تک ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ مسافر آتے رہے جاتے رہے۔ کوئی ٹرام میں بیٹھتا اور کوئی اترتا۔ لیکن عورت ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ اور پھر ہجوم میں غائب ہو گئی۔ اس عورت کی تصویر اگر میں کھینچ دوں تو شاید آپ کے ذہن میں خد وخال ابھر آئیں۔ اگر عورت خوبصورت ہوتی تو میں اسے قوسِ قزح سے تشبیہہ دیتا۔ اس کی آنکھوں کو کنول کے پھولوں کی طرح بتاتا۔ اس کے رخساروں کو پھولوں کی پتیوں کی طرح سرخ کر دیتا۔ اس کی نگاہوں میں بجلی کی تابناکی بھر دیتا۔ اس کے سینے میں سمندر کا سارا مد وجزر بھر دیتا۔ اور اس کے کوٹھے ڈوریٔ لیلیٰ سے زیادہ خوبصورت دکھاتا۔ اور اس کے جسم کی رنگت برف کی طرح سفید بتاتا۔ لیکن میرے سامنے ایک دبلی پتلی سی عورت کھڑی تھی جس نے ایک پھولوں والی دھوتی پہن رکھی تھی۔ چہرے کی رنگت غالباً گندمی ہونی چاہیئے۔ لیکن جوں جوں اس

عورت کی عمر بڑھتی گئی تو اس کی رنگت سیاہ ہوتی گئی ۔ گال پچک گئے تھے اور ان پر سیاہ چھائیاں اُبھر آئی تھیں ۔ بالوں میں چمک کے بجائے روکھا پن تھا اور آنکھوں سے حُزن و ملال کی جھلک نمایاں تھی اور چال میں نقاہت اور کمزوری آچکی تھی ۔ اگر اس عورت کا سر سے لیکر پاؤں تک جائزہ لیا جائے تو اس سے صاف ظاہر ہوگا کہ کافی عرصے سے اس عورت نے اچھی غذا نہ کھائی ہوگی ۔ غذا کی کمی کی وجہ سے جسمانی دل کشی غائب ہو چکی تھی ۔ ایک بات جو قابلِ غور تھی وہ تھی اس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک جو بے حد سرخ تھی ۔ سارے جسم میں صرف یہی جگہ تھی جہاں خون کا گمان ہو سکتا تھا رخساروں پر اگرانہیں رخسار کہا جا سکے ، پوڈر چھپڑ کا ہوا تھا اور ہلکی سی سرخی بھی ملی ہوئی تھی ۔ لیکن دھوپ میں چلنے پھرنے کی وجہ سے پوڈر اور سرخی اس طرح گڈ مڈ ہو گئے تھے کہ چہرے پر عجیب قسم کی اشکال نمودار ہو رہی تھیں ۔ وہ اس وقت بالکل ایک پرانی کار کی طرح دکھائی دیتی تھی ۔ جو ستواتر استعمال سے اپنا رنگ روپ کھو بیٹھتی ہے — میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ٹرام مسافروں سے کھچا کھچ بھر گئی — اور چل پڑی ۔

کئی دن گذر گئے میں اس طرف نہ گیا — عورت کی یاد میرے دل سے اُتر چکی تھی ۔ اس کے نقش آہستہ آہستہ میرے ذہن کی چادر پر مدھم پڑتے جا رہے تھے آخر میرا اور اس کا کیا رشتہ تھا میں کیوں اس عورت کے متعلق سوچتا اگر وہ کمزور ہے ، بدصورت ہے ، اسے روٹی نہیں ملتی تو میں کیا کروں ۔ اگر وہ غریب ہے تو میں اسے امیر کس طرح بنا سکتا ہوں ۔ میں خود بھی غریب ہوں ، میں ہی نہیں اس دنیا میں لاکھوں ،

کروڑوں آدمی غریب ہیں۔ ناتواں ہیں، بدصورت ہیں۔ بھوکے رہتے ہیں، ننگے رہتے ہیں۔ بھلا میں ان کی بھوک اور ناداری کس طرح دور کرسکتا ہوں۔ اس دنیا میں کچھ اور لوگ بھی ہیں جو امیر ہیں، جو اچھا کھانا کھاتے ہیں اور نفیس کپڑے پہنتے ہیں۔ عالیشان کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ اور ریس کھیلتے ہیں۔ بھلا ان باتوں کا میرے پاس کیا علاج ہے؟

اس دن جب میں گھر سے نکلا تو آسمان نیلا اور شفاف تھا اور ہلکی ہلکی سی دھوپ تھی۔ اور دسمبر کا مہینہ۔ یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل "ٹہلتا ٹہلتا تو بازار چل" آج بازار میں کافی رونق تھی۔ ضرورت سے زیادہ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج کرسمس ہے جبھی لوگ خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ ان کی بیویاں تھیں۔ جو بن ٹھن کر نکلی تھیں۔ اور اپنے بچوں کو بھی ساتھ لائی تھیں۔ لال پیلے غبارے پکڑے ہوئے ہنستے کھیلتے ہوئے یہ لوگ دکانوں سے نکل رہے تھے اور چیزیں خرید رہے تھے۔ اور اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ میں نے اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالی، قمیص کافی گندی اور میلی تھی۔ کالر پھٹ چکا تھا اور بوٹوں پر کئی ہفتوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اس دن مجھے اپنے گندے اور میلے کپڑوں پر سخت غصہ آیا۔ میرے قدم یکایک اس عالیشان دکان کی طرف اٹھ گئے۔ (نمائشی بکس) میں کپڑے بڑی شان سے سجائے گئے تھے۔ ادھر ادھر عورتوں کے کپڑے تھے۔ خوبصورت مجسموں کو رنگ برنگ ساڑھیاں پہنائی گئی تھیں۔ ایک دو مجسموں کو فراک اور بلاوز پہنائے گئے تھے۔ اور مجسموں میں ان تمام نقوش کو واضح کیا گیا تھا جس سے عورت کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہاتھ

کی انگلیاں مخروطی اور ناخنوں پر بلا کی سُرخی سپید رنگت پر سیاہ بلاوز آویزاں تھا ان میں سے بازو سیب کی شاخوں کی طرح جھانک رہے تھے۔ آنکھوں میں بجلی تھی۔ برف تھی، اور بھنویں کمان کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ہار سنگھار کا سارا سامان رکھا ہوا تھا۔ یہ سبز سبز منکوں کی مالا تھی جو کسی حسین عورت کی گردن میں حمائل ہو کر ایک عجیب اثر پیدا کر سکتی ہے۔ میں زیادہ عرصہ ادھر نہ ٹھیر سکا اور مردوں کی طرف چلا گیا۔ سامنے ایک سفید قمیص نظر آئی اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی قیمت ۲۵ روپے۔ اور مجھے جھٹکا لگا۔ اور میری نگاہ مفلر پر جمی ہلکا آسمانی رنگ تھا۔ اس مفلر کا میری گردن کے گرد ایک جھرجھری سی آگئی۔ اور گردن کے ارد گرد ایک ملائم سی حرارت عود کر آئی۔ قیمت ۳۵ روپے چودہ آنے۔ قیمت پڑھتے ہی گردن اکڑ گئی۔ میں فوراً آگے بڑھا۔ قریب ہی ایک جراب میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور پھر اس نے شرم سے گردن جھکالی۔ قیمت صرف ۸ روپے ۱۵ آنے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا ہو۔ ساتھ ہی فیلٹ ہیٹ نے چھینک ماری اور کہنے لگی۔ "کیا مجھے نہ خریدو گے؟" اور میرا ہاتھ یکا یک اپنے بالوں پر جا لگا۔ بال سخت اور کھردرے تھے۔ ہاتھ اپنی جگہ پر آگیا۔ اور ماتھے پر ہلکا سا پسینہ آگیا۔ اتنے میں ایک آدمی نے آکر کہا۔ "Please to this side" اور میں بالکل ایک طرف ہو گیا۔ اور دوکان کو چھوڑ کر آگے چل دیا۔ لوگ جوق در جوق آرہے تھے۔ چیزیں خرید رہے تھے اور کاروں میں بیٹھ کر جا رہے تھے۔ اور میں پیدل چلتا ہوا ٹرام کے اڈے پر آگیا۔ اور جونہی ٹرام پر چڑھنے لگا —— وہ عورت نظر آئی۔ وہی پھولوں والی دھوتی، چلنے پھرنے کا وہی انداز، نگاہوں میں

ناامیدی۔ اور چال میں نقاہت اور کمزوری ــــ آنکھیں پھٹی پھٹی کسی کی متلاشی۔ لوگوں کو دیکھتی ہوئیں۔ پل بھر کے لئے جائزہ لیتی ہوئیں۔ کبھی کبھی امید سے وابستہ ہو کر۔ اور آخر کار ناامیدی کے گڑھے میں گر کر نیچے جھک جاتیں۔ لوگ ٹراموں پر چڑھ رہے تھے اتر رہے تھے اور اس کی نگاہیں مسافروں کو ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ اس وقت میرے دل میں یہ آیا کہ آگے بڑھ کر اس عورت سے بات کروں۔ پوچھوں کہ وہ یہاں کیوں آتی ہے۔ اسے یہاں کیا کام ہے۔ اس کا رنگ کیوں پیلا ہے۔ اس کی آنکھیں اندر کیوں دھنسی ہوئی ہیں۔ اور وہ کیوں بار بار مسافروں کی طرف دیکھتی ہے۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا لیکن عورت میری منظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اسے نہ پا کر میرے دل میں یاس اور غم کے بادل اُمڈ آئے اور زندگی کی بےحسی اور بےبسی پر سخت غصہ آیا۔

وہ صبح بہت ہی خوبصورت تھی۔ دلکش تھی، آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ اور لوگ جوق در جوق ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اس وقت صرف میں اداس تھا اور وہ عورت اداس تھی۔ دن بھر اس عورت کی تصویر میری نگاہوں میں گھومتی رہی۔ اور اس دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر دوبارہ یہ عورت مجھے ملی تو میں ضرور اس سے باتیں کروں گا۔ اس کی مدد کروں گا۔ اس سے پوچھوں گا کہ وہ کیا کرتی ہے اس کے کتنے بچے ہیں۔ اس کا گھر کہاں ہے؟

اسی سوچ بچار میں کئی دن گذر گئے۔ اور میں اس طرف نہ جا سکا۔ اس عورت کی یاد دل سے نکل چکی تھی۔ بھلا ایسی تصویریں کب تک ذہن میں رہتی ہیں۔

یہ تصویریں سمندر کی لہروں کی طرح ہوتی ہیں۔ جو آنِ واحد میں ذہن کے سامنے آتی ہیں اور ذہن کے پردے سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ اور ذہن پر ایک خفیف جھٹکا چھوڑ جاتی ہیں۔ لیکن یہ جھٹکے اتنے خفیف ہوتے ہیں۔ اتنے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں کہ کوئی داغ نہیں چھوڑتے۔ صرف ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ جو لمحہ بھر کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اور پھر انسان کا ذہن دوسری طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا کئی دن گذر گئے، راتیں گذر گئیں۔ خوابناک راتیں اور کئی حسین دن آئے اور چلے گئے۔ اندھیری راتیں آئیں اور دلوں میں پرانی یادوں کو اجاگر کر گئیں۔ اور پھر ایک شام میں اسی طرف سے گذرا۔ اس دن میری جیب میں کچھ روپے تھے۔ اسی لئے میری چال میں خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ شام کے وقت اس بازار میں کم بھیڑ ہوتی ہے۔ یہاں کے دوکاندار لاکھوں روپے کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے شام ہوتے ہی وہ دوکانیں بند کر لیتے ہیں اور اپنی اپنی عشرت گاہوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ وہاں شراب ہوتی ہے مرغن کھانا ہوتا ہے۔ اور ان کی گوری گوری خوبرو محبوبائیں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ ان سے ہنستے ہیں "کھیلتے ہیں" ناچتے ہیں پھر عہد و پیمان ہوتے ہیں۔ وفا اور بے وفائی کے چرچے ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی بیویوں کے کرخت سلوک کا رونا روتے ہیں۔ اور اپنی محبوباؤں کے کندھوں پر سر رکھ کر اپنے زائد سرمائے کا چرچا کرتے ہیں۔

آج جب میں اس عالیشان دوکان کی طرف نکلا تو ان شیشوں کی الماریوں میں سے چند آدمی کپڑے نکال رہے تھے۔ میرے سامنے سب شیشے کی الماریاں خالی ہوئیں صرف Hangers باقی رہ گئے تھے۔ کئی بار میرے دل میں آیا۔ کہ کسی رات

ادھر آؤں گا ۔ اور ان شیشے کی الماریوں کو توڑ کر اپنے لئے کپڑے لے جاؤں گا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ رات کے وقت یہ کپڑے ان نمائشی بکسوں میں نہیں رکھے جاتے ۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں کچھ اداس سا ہو گیا ۔ اور آگے بڑھا ۔ تاریکی کافی بڑھ گئی تھی ۔ اور راستہ آوارہ اور اکیلا دکھائی دیتا تھا ۔ ٹرام میں مسافر کم تھے ۔ دکانوں کے قریب مسلح چوکیدار نظر آ رہے تھے ۔ یہ چوکیدار میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے میں ان کی نگاہوں سے بچتا ہوا آگے بڑھ گیا ۔ آج مجھے پورا یقین تھا کہ وہ عورت نظر نہ آئے گی ۔ بھلا اس وقت وہ کیا کرے گی آ کر ۔ ایک دن وہ مجھے دوپہر کو ملی تھی ۔ اور پھر ایک صبح ملی تھی ۔ وہ شام کو یہاں کس طرح آ سکتی تھی ۔ میں چلتے چلتے اسی اڈے کے قریب پہنچ گیا ۔ ٹرامیں کھڑی تھیں ۔ مسافر بہت کم تھے ۔ میں نے چڑھنے کی کوشش کی ۔ لیکن میرے قدم پھر رک گئے ۔ یونہی خیال آیا کہ وہ عورت کہاں ہو گی اور میں نے پھر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا ۔ جیسے کوئی کسی گم شدہ چیز کو تلاش کر رہا ہو ۔ یکایک میری نگاہیں بجلی کے کھمبے کے قریب جا کر اٹک گئیں ۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ عورت اسی کھمبے کے قریب کھڑی تھی ۔ میں نے عورت کی طرف دیکھا اور عورت نے میری طرف ۔ عورت کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوئی ۔ ایک شعلہ بلند ہوا ۔ جیسے چقماق کے دو پتھروں کے ٹکرا جانے سے پیدا ہوتا ہے ۔ اور میں جلدی سے ایک طرف کو ہو گیا میں نے دیکھا عورت کی نگاہوں میں اداسی آ گئی تھی ۔ وہ چمک غائب ہو گئی تھی ۔ اور وہ مری ہوئی نگاہوں سے مسافروں کو دیکھنے لگی تھی مسافر اتر رہے تھے اور چڑھ رہے تھے ۔ اس وقت مسافر بہت کم تھے ۔ اور خاص کر اس حلقے میں روشنی بہت کم تھی ۔ تاریکی زیادہ تھی ۔ میں عورت کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا ۔ لیکن عورت مجھے نہ دیکھ سکتی تھی میرے

دل میں خیال آیا کہ اس سے جاکر ملوں ۔ باتیں کروں اور پوچھوں کہ وہ کیا چاہتی ہے وہ اتنی اداس کیوں رہتی ہے ۔ آج میری جیب میں روپے تھے ۔ اور میں نے سوچا کہ یہ روپے اسے جاکر دیدوں ۔ اور کہوں کہ آج کی رات گھر جاکر چپکے سے سوجاؤ ۔ کسی گاہک کا انتظار نہ کرو ۔ کسی مرد کا انتظار نہ کرو ۔ عورت کھمبے کے قریب اکیلی کھڑی تھی ۔ اب اس نے اپنی پیٹھ میری طرف کرلی تھی ۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہوگی ۔ اس کی نگاہوں میں کیا تھا ۔ اس کے دل میں کیا تھا ۔ وہ کیوں لوگوں کی طرف بار بار دیکھتی ہے ۔ اس کا جسم کیوں پتلا اور دُبلا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں چمک کیوں نہیں ۔ اس کی چال میں توانائی کیوں نہیں ۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کیوں نہیں ۔ وہ کیوں ہر صبح ہر دوپہر، ہر شام اس شہر کے سب سے بڑے بارونق بازار میں آتی ہے جہاں صرف شرفار کا گذر ہوتا ہے ۔ جہاں صرف امیروں کا گذر ہوتا ہے ۔ جہاں عالیشان عمارتیں ہوتی ہیں ۔ شاندار ہوٹل ہوتے ہیں ۔ جہاں لوگ کاروں میں بیٹھ کر بازار کی رونق دیکھتے ہیں ۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ یہ چند سکے اسے جاکر دیدوں ۔ اور اس سے کہوں کہ آج رات آرام اور چین سے گذار، وا در خاموشی سے اپنے کمرے میں جاکر سوجاؤ ۔ اس کا کمرہ کہاں ہوگا ۔ وہ سوتی کہاں ہوگی ۔ میں نے سوچا اور یکایک یہ خیال میرے ذہن میں کوندا کہ اگر آج میں نے اسے روپے دیدئے تو وہ کل کیا کرے گی ۔ پرسوں کیا کرے گی ۔ اترسوں کیا کرے گی ۔ میری ایک دن کی خیرات سے اسے کیا فائدہ پہنچے گا ۔ یہ اس مسئلہ کا حل نہ تھا ۔ اسے پھر اس بازار میں آنا ہوگا ۔ اور اپنے جسم کو فروخت کرنا ہوگا ۔ اس خیال کے آتے ہی میری گرفت روپوں پر سخت ہوگئی ۔ اور مجھے اپنی غربت کا احساس ہونے لگا اور میں نے نگاہیں موڑلیں

لیکن نگاہیں پھر اسی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ وہ گھر کیوں نہیں جاتی۔ وہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔ کیوں بار بار مسافروں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ مجھے اس عورت کو اس حالت میں دیکھ کر غصہ آرہا تھا۔ اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں عجیب قسم کی بدکار عورت ہے۔ جسے روپوں کے لئے اپنا جسم بیچنا پڑتا ہے۔ اور رتی بھر شرم محسوس نہیں کرتی اور پھر مجھے اس بات کا خیال آیا۔ کیا اس کرۂ ارض پر کوئی ایسا ملک ہے جہاں عورتوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اپنا جسم بیچنا نہیں پڑتا اور ذہن پر دباؤ ڈالنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ ہاں ہے۔ واقعی ہے۔ میں نے اخباروں میں پڑھا تھا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے۔ کہ اس ملک سے بہت دور ایک اور دیس ہے جہاں خوب برف پڑتی ہے اور سردی ہوتی ہے۔ جہاں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت ہے۔ سُنا ہے کہ اس دیس میں عورتوں کو اپنا جسم بیچنا نہیں پڑتا۔ جہاں عورتیں ان پڑھ نہیں ہوتیں۔ مردوں کی غلامی نہیں ہوتی۔ جہاں وہ بھی دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ ہوائی جہاز چلاتی ہیں۔ فوج میں کام کرتی ہیں۔ ان کی صحت اچھی ہوتی ہے وہ محبت کرتی ہیں۔ شادی کرتی ہیں۔ بچے پیدا کرتی ہیں اور بڑے مزے سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ وہ دیس یہاں سے کتنا دُور ہے۔ کیا وہ نظام یہاں نہیں آسکتا۔ اور یکایک مجھے یہ خیال آیا کہ میں جاکر اس عورت سے کہوں۔ "کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں!! وہ دن دُور نہیں۔ جب تمھیں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اس اڈے پر نہ آنا ہوگا۔ اپنا جسم نہ بیچنا ہوگا۔ اور دیس والے تمھاری عزت کریں گے تمھیں کام دیں گے۔ تمھیں روٹی دیں گے۔ تمھارے بچوں کو دودھ دیں گے۔ عورت میری بہن۔ وہ دن ضرور آئے گا جب تمھاری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے۔ جب

تمہارے رخساروں پر چھائیاں نہ ہوں گی۔ بلکہ شفق کی لالی ہوگی۔ جب تیرے ہونٹوں پر سُرخی کی جگہ اصل خون دوڑے گا۔ جب تیرا سینہ گوشت سے بھرا ہوا ہوگا۔ جب تیرے کوٹھوں میں کشش ہوگی اور جب تیری آنکھوں میں یاسیت کی جگہ اُمید کے چراغ جھلملائیں گے۔ جب لوگوں میں اتنی طاقت آجائے گی کہ وہ نفع خوروں اور بلیک مارکیٹوں کے ہاتھوں سے طاقت چھین لیں گے۔ اور اس دَور والے دیس کی طرح نظامِ حکومت قائم کریں گے رو مت میری بہن۔ اس اکیلی رات میں اکیلی نہ رو ——— اور میں یہ سوچتا ہوا خاموش ہوگیا۔ کیونکہ ذہن میں یہ خیال بھی آرہا تھا کہ جب تک وہ نظام نہیں آتا تب تک وہ کیا کرے ——— تب تک وہ کیا کرے۔ یہ سوچ کر میں ٹرام میں بیٹھ گیا۔ اور ٹرام اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھی۔ میں نے کھمبے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ کھمبا اکیلا کھڑا تھا۔ اور عورت وہاں سے جا چکی تھی ———

ہنس راج رہبر

ماحول

تمہارا وہ خط ملا جس میں تم نے صرف ایک فقرہ لکھا ہے "آنند، کیا تم زندہ ہو؟"
ہاں، میں زندہ ہوں اور اپنے ماحول سے زیادہ زندہ ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں تمھیں عرصے سے خط نہیں لکھ سکا۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ خط لکھنے میں میں تساہل سے کام نہیں لیتا۔ ہر خط کا جواب دینا میں نے اپنی عادت بنالی ہے۔ پھر تم سے خط وکتابت کرنا تو خوشی کی بات ہے۔ تمھارا خط پاکر میں کھل اٹھتا ہوں اور تمھیں خط لکھ کر ایک راحت سی نصیب ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ میں تمھیں اپنی بابت سب کچھ یوں لکھ دیتا ہوں کہ جیسے اپنے دل کی بات اپنے آپ سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے ذرا بھی تذبذب نہیں ہوتا۔ یہ سوچنا ہی نہیں پڑتا کہ یہ باتیں پڑھ کر تم میرے متعلق کیا خیال کروگے۔؟
تمھیں محض راضی خوشی تو لکھنا نہیں ہوتی۔ وہ سب کچھ لکھنا ہوتا ہے جو خط لکھتے وقت میں محسوس کر رہا ہوتا ہوں اور ان دنوں میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں وہ اس قدر زیادہ ہے کہ ایک نہیں دس خط لکھے جا سکتے ہیں۔ کئی مرتبہ ارادہ بھی کیا ہے لیکن ہر مرتبہ ناکام رہا۔ — چند سطریں لکھنے کے بعد اکتا کر اٹھ بیٹھتا ہوں (جو کچھ مجھے کہنا

ہوتلسہے کہہ نہیں پاتا۔ ہر لفظ بیگانہ اور اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ میں وہی ہوں۔ تحریر وہی ہے۔ لیکن الفاظ کی بناوٹ ایسی بھدّی اور مکروہ نظر آتی ہے جیسے میرے خیالات نے میرے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہو اور وہ ان الفاظ میں بیٹھے میرا منہ چڑا رہے ہوں۔

لکھنا تو درکنار ان دنوں تو پڑھنا بھی محال ہے۔ مارکسزم اور لینن ازم کی کتابیں بند کر کے الماری میں رکھدی ہیں۔ سوچا فلسفہ ذہن قبول نہیں کرتا۔ شاعری ہی سے جی بہلاؤں۔ لیکن یہ تمھیں سن کر تعجب ہوگا کہ غالب کا دیوان کھلا پڑا رہتا ہے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا کرتا ہوں جیسے اس کے سب اشعار بے معنی ہوں ان میں کوئی کیف، کوئی نشاط نہ ہو۔ بس بیٹھے رہنے، چپ چاپ اور بے کار بیٹھے رہنے کو جی چاہتا ہے، اپنے آپ سے اور ماحول سے بے نیاز ہو کر جیسے ایک غیر مرئی جسم خلا میں معلق ہو۔

اب تمھیں بتاؤ کہ جو آدمی خلا میں معلق رہتا ہے وہ خود کیا لکھے گا؟ گو میرا جسم مادّی ہے۔ جس کرسی پر میں بیٹھا ہوں اس کے بازو اتنے ہی ٹھوس ہیں جتنی کاٹھ کی بنی ہوئی کوئی شے ہو سکتی ہے۔ سامنے میز ہے۔ میز پر جو چیزیں پڑی ہیں وہ بھی مادّی اور ٹھوس ہیں۔ کمرہ ہے۔ کمرہ کی دیواریں ہیں۔ گلی ہے اور گلی کے لوگ ہیں اور ان سب کے متعلق بہت سے خیالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ بس ان خیالات کے بارے میں سوچتا ہوں اور اس سوچ میں یوں کھو جاتا ہوں جیسے خلا میں تیر رہا ہوں۔ یہ میری کیفیت ہے۔ اب یہ تم جانو کہ میں مردہ ہوں یا زندہ۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ جو آدمی سوچ سکتا ہے وہ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی زندہ ہے جانے وہ کب عمل پر آمادہ ہو جائے۔

سے مجھے تمھارے اس خط کے الفاظ بھی یاد آرہے ہیں جو تم نے میرے بنارس سے لوٹنے کے بعد لکھا تھا۔ ''جب تم ماحول کو موافق نہیں پاتے تو تمہاری باغی روح چیخ اٹھتی ہے وہ تمہیں کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور تم بھاگ کھڑے ہوتے ہو''

تمہاری بات کافی حد تک درست ہے۔ لیکن دوست بھاگ کر آدمی جائے گا کہاں ؟ ہر جگہ وہی ماحول ہے۔ وہی لوگ ہیں۔ وہی ہندوستان ہے۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ اب یہی سوچا ہے کہ اس ماحول کو سمجھوں۔ ان لوگوں کو سمجھوں۔ ان کے سُکھ دُکھ، نفرت اور محبت کو سمجھوں۔ پھر شاید جینے کی کوئی بہتر صورت نکل آئے۔

اب تک میں نے تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی ہے تو یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی نفرت اور محبت میری نفرت اور محبت سے مشابہ ہے اور ان کی روحیں بھی میری روح کی طرح باغی ہیں ہم سب اس ماحول سے بیزار ہو کر ادھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں اور تیز تیز قدموں سے کسی ایک ہی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

یہ خیالات ہیں جو اِس وقت میرے ذہن میں اُٹھ رہے ہیں اور متواتر اٹھتے رہتے ہیں اور ان کے پس منظر میں وہ ماحول ہے جس میں اب رہتا ہوں۔ اور وہ لوگ جو اس ماحول کو بنانے والے ہیں۔ تم یقیناً اس ماحول اور ان لوگوں کی ایک جھلک دیکھنا پسند کرو گے۔ اس کے بغیر میرے موجودہ خیالات اور میرے ذہنی رجحان کو تم سمجھ نہیں سکو گے۔

صبح سویرے بہت سویرے میری آنکھ اچانک کھل جاتی ہے۔ کیونکہ جب ہاؤ ہُو کے شور سے سارا ماحول جاگ اٹھا ہو تو آدمی خواہ کتنا ہی نیند کا ماتا کیوں نہ ہو اس کے

لئے سوئے رہنا ممکن نہیں۔ صبح جب طبیعت سکون ڈھونڈھتی ہے میں تیز تیز چیخیں سننے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

گلی کے دوسری طرف سامنے جو گھر ہے اس میں دو لڑکے رہتے ہیں ان کی عمر دس اور چودہ سال کے درمیان ہے۔ جسم چھریرے۔ رنگ گندمی اور کپڑے میلے ہیں۔ وہ علی الصبح اُٹھ کر کبوتر اُڑاتے ہیں۔ انھیں آسمان میں اُڑتے اور قلابازیاں لگاتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اچھل اچھل کر چیختے ہیں۔ جیسے ان کی چیخیں آسمان تک پہنچ جائیں گی۔ کبوتروں تک ان کا پیغامِ مسرت لے جائیں گی انھیں اور اونچا اڑنے میں مدد دیں گی۔!

جب کوئی کبوتر اُن کی چھت سے اٹھ کر اوپر اڑنے کی بجائے کسی قریب کے مکان پر جا بیٹھتا ہے تو وہ دونوں لڑکے بیک وقت ہا ہو ہا ہو چلانا شروع کر دیتے ہیں تالیاں پیٹتے ہیں اگر کبوتر پھر بھی نہیں اُڑتا تو کنکر پھینکتے ہیں۔ اس کنکر پھینکنے پر کئی مرتبہ جھگڑا پیدا ہو گیا ہے۔ کل ہی وہ موچی ان کے گھر میں گھس آیا تھا اور گرج کر کہا تھا "بدمعاش! سور! سارا محلہ سر پہ اٹھائے رکھتے ہیں۔ اب کنکر پھینکا تو کھال اُدھیڑ لوں گا"۔

باپ نے بیٹوں کو خوب مارا۔ لیکن وہ دوسرے دن پھر کبوتر اڑا رہے تھے۔ پھر کنکر پھینک رہے تھے۔ یہ مار تو موچی کا غصہ دور کرنے کے لئے پڑی تھی۔ لیکن جب باپ کو خود غصہ آتا ہے تو وہ انھیں اتنا مارتا ہے۔ اتنا مارتا ہے کہ دیواریں تک کانپ جاتی ہیں۔ ماں کا بھی یہ حوصلہ نہیں پڑتا کہ درمیان میں پڑ کر بیچ بچاؤ کر دے۔ شاید وہ بیچ بچاؤ کرنا ہی نہیں چاہتی ہے۔ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہتی ہے جیسے یہ کریہہ منظر دیکھنے کی عادی ہو چکی ہو۔ جب خود اس پر مار پڑتی ہے تو کون

بیچ بچاؤ کرنے آتا ہے۔ مار کھاتے کھاتے اس کی پسلیاں پک چکی ہیں اور جب ماں کو غصہ آتا ہے تو وہ گود کے بچے پر برس پڑتی ہے۔ اسے پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دیتی ہے۔ یہ دونوں لڑکے جب آپس میں لڑنے پر آتے ہیں تو لڑتے ہی رہتے ہیں۔ باپ گھر میں موجود نہ ہو تو قیامت برپا کر کے چھوڑتے ہیں۔ ماں بیچاری منہ تاکتی رہجاتی ہے اسے گلہ ہے کہ موئے جوان ہونے سے پہلے ہی ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔

اِس گھر میں غصّہ کسی سے بھی سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ جیسے وہ غصہ کرنے کو اکھٹے ہوئے ہوں اور غصّہ کر کے جی رہے ہوں۔

باپ گلی کے باہر پانی کی سبیل کے قریب جو ٹال ہے اس پر لکڑیاں پھاڑتا ہے اور انھیں اٹھا کر گاہکوں کے گھر چھوڑ آتا ہے۔ لڑکے کوئلے کی دوکان پر کام کرتے ہیں دن بھر دوکاندار کی گھرکیاں اور گاہکوں کا عتاب سہتے ہیں۔ صرف گھر ہے جہاں انھیں ایک دوسرے سے برابری کا درجہ حاصل ہے۔ گھر ہے جہاں اپنے دل کی گھٹی گھٹی حسرتوں کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہی حسرتیں جو چیخوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں آسمان میں اڑنا چاہتی ہیں۔

شروع شروع میں میں بھی ان لڑکوں پر ناراض ہوتا تھا اور انھیں چیخنے سے منع کرتا تھا۔ لیکن اب جب یہاں رہتے کافی عرصہ ہو گیا ہے منع کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھے انھیں چیخیتے سنتا رہتا ہوں۔ ان چیخوں کا مفہوم روح میں بھر لینا چاہتا ہوں۔ جانے کیوں۔ اب یہ چیخیں بری لگنے کی بجائے پیاری لگتی ہیں۔ کئی مرتبہ جی میں آتا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ مل کر کبوتر اڑاؤں۔ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاؤں۔ ہاہو! ہاہو!

جب یہ لڑکے کبوتر ڈربے میں بند کر کے کام پر چلے جاتے ہیں تو بھی شور بند نہیں ہوتا۔ گلی میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ سامنے کے موڑ پر میونسپل کمیٹی کا نل ہے۔ چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے اور اس پر ہر وقت پانی بھرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ بالٹی سے بالٹی اور برتن سے برتن کھنکتا ہے۔ پانی بھرنے والوں کی آپس میں تکرار رہتی ہے پہلے، پیچھے آئے ہوؤں میں جھگڑا رہتا ہے۔ کوئی نہاتا ہے۔ کوئی کپڑے دھوتا ہے۔

نل کے قریب ایک چھوٹے سے کمرے میں جمعدارنی رہتی ہے۔ اس کا نام پاربتی ہے۔ لیکن سب لوگ اسے جمعدارنی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا گھر والا جمعدار ہے میونسپلٹی میں ملازم ہے۔ نیلا صافہ، نیلا کرتہ اور نیلا پاجامہ پہنتا ہے۔ جمعدارنی کا یہ دوسرا خاوند ہے۔ بچارے کو پچھلی عمر میں عورت نصیب ہوئی ہے۔ عمر تو دونوں کی برابر ہی ہوگی لیکن جمعدارنی ہٹی کٹی ہے، وہ اس کے مقابلہ میں بالکل دبلا پتلا اور مریل نظر آتا ہے۔ میں نے اسے کبھی بات کرتے نہیں دیکھا جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرتا ہے اس کے برخلاف جمعدارنی ہر وقت گرجتی رہتی ہے۔ لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ اگر اسے کبھی نل سے پانی لینا ہو تو سب سے پہلے بھرنے کی کوشش کرتی ہے۔ "میں صاحب سے شکایت کروں گی اور نل بند کرا دوں گی۔" لوگ نل بند کرانے کی دھمکی سے تو نہیں ڈرتے مگر اس کی چرب زبانی سے ضرور ڈرتے ہیں۔ ویسے نل بند کرانا وہ خود بھی نہیں چاہتی۔ اسے تو محض یہ جتانا ہوتا ہے کہ نل میونسپلٹی کا ہے اور میرا جمعدار میونسپلٹی کا ملازم ہے اس لئے نل پر سب سے زیادہ حق میرا ہے۔

اس خاوند سے جمعدارنی کی ایک لڑکی للّی ہے، جس کی عمر اب سولہ سترہ

سال کے قریب ہے لیکن نین نقش جاذب نظر ہیں۔ جمعدارنی قلعہ میں صفائی کے لئے
جاتی ہے۔ اس کے ہمراہ یہ لڑکی بھی جاتی ہے۔ اس کی بڑی لڑکی جمیا بھی جو پہلے خاوند
سے ہے اسی گلی میں رہتی ہے۔ اس کا گھر والا کام پر جاتا ہے اور وہ چارپائی بچھائے
گلی میں بیٹھی رہتی ہے۔ رنگ گورا جسم بھرا ہوا اور سڈول ہے۔ میرے ایک دوست
نے اسے دیکھ کر کہا تھا: "اگر یہ ہن اوڑھ کر رہے تو بیگم نظر آئے"۔

ماں بیٹی ـــــ جمعدارنی اور جمیا میں اکثر لڑائی رہتی ہے۔ جمیا نل پر آئی نہیں کہ
لڑائی شروع ہوئی نہیں۔ اور ایک دفعہ شروع ہو کر جلد بند ہونے میں نہیں آتی۔ دونوں
ایک دوسرے کو کوستی ہیں۔ بیہودہ اور غلیظ گالیاں دیتی ہیں اور ان گالیوں کو زیادہ
تیز اور ترش بنانے کے لئے گلے کی تمام قوت صرف کر دیتی ہیں۔ دونوں کے جبڑے
غصے سے تمتمانے لگتے ہیں اور ہونٹوں سے جھاگ نکل آتے ہیں۔ جمیا جب ماں کی ترشی
برداشت نہیں کر سکتی تو وہ اسے سخت سے سخت گالی دیتی ہے۔ للّی کی طرف اشارہ
کر کے کہتی ہے۔ "بیٹی کی کمائی کھانے والی تو کیا بولنے پر مرتی ہے۔ چلّو بھر پانی میں ڈوب مر"۔
جمعدارنی جھنجھلا اٹھتی ہے اور نوبت ہاتھا پائی پر آجاتی ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں
للّی کھڑی گہری سیاہ آنکھوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ دیکھتی رہتی ہے۔ اس نے ماں یا بہن کے
حق میں کبھی ایک جملہ نہیں کہا۔ منع بھی نہیں کیا۔ ہاں، جمعدار اگر گھر پر ہوتا ہے تو حقہ چھوڑ کر
باہر آجاتا ہے، انھیں الگ الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کی پیش نہیں جاتی۔
ہتھنیوں کی دھکم پیل کے سامنے بکرے کی اچھل کود کیا معنی؟

جمیا کو میں نے گلی کے اور کسی آدمی سے کبھی لڑتے نہیں دیکھا۔ چپ چاپ گھر
میں بیٹھی رہتی ہے۔ ننھے سے کھیلتی ہے۔ اگر کسی کو بات دریافت کرنی ہو تو نہایت حلیمی سے

جواب دیتی ہے۔ پڑوس میں جو خاتون رہتی ہے اس کے ساتھ اس کی گہری چھنتی ہے۔ وہ اپنے دل کا راز بھی اس سے کہتے نہیں جھجکتی۔ ایک دن جب وہ ماں سے لڑ جھگڑ کر آئی تھی تو خاتون سے کہہ رہی تھی جب میں چھوٹی تھی تو یہ چڑیل مجھے اتنا مارتی تھی۔ اتنا مارتی تھی کہ میری رگ رگ دکھنے لگتی تھی اور روتے روتے گھگھی بندھ جاتی تھی اور جب میں تلی کی عمر کی تھی تو میری ہر بات پر شک کرتی تھی اور مجھے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی۔ اگر کہیں اس کے ساتھ بھی جانا ہوتا تو رستہ چلنا مشکل کر دیتی خواہ مخواہ کڑک کر کہتی کہ میں ادھر ادھر کیوں دیکھتی ہوں۔

لیکن اب جمیا خود مختار ہے۔ اس کا اپنا گھر ہے خاوند ہے بچہ ہے۔ وہ ماں کی ایک نہیں مانتی بلکہ موقع بے موقع اسے چڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ جیسے وہ اس سے لڑنا چاہتی ہے۔ وہ جب لڑ کر لوٹتی ہے تو اس کے چہرے پر اطمینان کی ایسی جھلک ہوتی ہے جیسے اس کی روح کا کوئی زخم مندمل ہو رہا ہو۔

خاتون دبلی پتلی عورت ہے۔ بات سلجھی ہوئی اور مختصر کرتی ہے۔ سینا اور پرونا کر کے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پالتی ہے وہاں اس کی طرح دبلی پتلی اس کی ایک لڑکی ہے۔ عمر بارہ تیرہ سال ہوگی۔ وہ محلہ کے بچوں سے مل کر کھیلا کرتی ہے۔ خاتون کا آگے پیچھے اور کوئی نہیں، بس یہ بیٹی ہے اور وہ اسے اپنی روح کی طرح پیار کرتی ہے۔ اسے کھیلتی کودتی دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ لیکن گلی کے ادھر ادھر محلہ میں قدامت پسند اور پرانی وضع کے لوگ بستے ہیں، انھیں بڑی لڑکی کا کھیلنا کودنا برا لگتا ہے۔ چار پانچ روز ہوئے کہ شام کی سیر سے لوٹ رہا تھا دیکھا کہ خاتون کے گھر کے سامنے مجمع لگا ہوا ہے اور گرم گرم گفتگو ہو رہی ہے۔ گفتگو کا موضوع تھی خاتون کی بیٹی! خاتون بیٹھی

سنتی رہی اور سن کر بولی۔ "آپ بتائیں میں اس بے چاری کو کس طرح سارا دن اس اندھیری کوٹھری میں بند رکھوں۔"

اس کا گھر تنگ و تاریک اندھیری کوٹھری ہی تو ہے۔ لیکن محلہ والوں کو اس کی یہ دلیل کچھ جچی نہیں۔ ان کے ترجمان نے کہا۔ "ہمارا کیا ہے۔ ہم تو تمھارے بھلے ہی کی کہتے ہیں۔ اس طرح پھرے گی تو جوان لڑکی چوپٹ ہو جائے گی۔"

خاتون اور جمیا کے گھر کے سامنے بنیئے کی دوکان ہے۔ دوکان کا چبوترہ گلی سے کافی اونچا ہے۔ بنیا اس چبوترے پر چوکڑی مارے یوں بیٹھا رہتا ہے جیسے جھیل کے کنارے بگلا۔ گاہک کے علاوہ وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ چائے کی ٹپیا جو سو ڈیڑھ سو قدم چل کر بازار میں چار آنے کو ملتی ہے وہ ساڑھے چار آنے میں دیتا ہے۔ کوئی اعتراض کرتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے۔ "ان کے پاس تھوک آتی ہے۔ انھیں مال سستا ملتا ہے۔" اسی طرح وہ بازار سے ہر چیز مہنگی دیتا ہے اور اکثر ہر چیز مہنگی ہی نہیں بلکہ گھٹیا اور خراب بھی ہوتی ہے۔ لیکن اسے گلی والوں سے گلہ ہے کہ وہ بازار میں چیز خریدنے کیوں جاتے ہیں؟ بکری زیادہ ہو تو وہ بھی اچھی اور سستی چیزیں مہیا کر سکتا ہے۔

میں نے اسے صرف ایک مرتبہ چبوترے کے نیچے گلی میں کھڑے دیکھا تھا اور وہ ایک لڑکے پر اس لئے ناراض ہو رہا تھا کہ اس نے اس کی دھوتی کو کیوں چھو دیا؟ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور سر گھٹا ہوا ہے۔ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو کراہت سی محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ چھپتا چلا تا کیوں نہیں۔ جیسے وہ ماحول کا حصہ نہیں۔ اس گلی کا فرد نہیں۔

بنیئے کی دوکان کی بغل میں ایک بڑھیا کی دوکان ہے۔ وہ بھولی کہلاتی ہے شاید اس کے متعلق بس یہی ایک بات دلچسپ ہے۔ وہ دو تین مکانوں کی مالک ہے۔ اکیلی جان ہے ان کا کرایہ کھاتی ہے۔ دوکان محض شغل کے طور پر کھول رکھی ہے گلی میں اس کا چرچا کبھی اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا میں نے اس کی بابت لکھ دیا ہے۔

اس سے آگے ہماری جمعدارنی کا مکان ہے۔ ہماری جمعدارنی اس لئے کہ وہ ہمارے ہاں صفائی کے لئے آتی ہے۔ وہ نہایت اہم اور دلچسپ کردار کی مالک ہے۔ ہتھنی کی طرح جھوم کر چلتی ہے۔ جب بولتی ہے تو اس کے لہجے میں تمکنت ہوتی ہے۔ جیسے سارے محلہ پر حکومت کر رہی ہو۔ ہم کہتے تھک گئے کہ صفائی جلد کر جایا کرو۔ لیکن وہ بارہ ایک بجے سے پہلے کبھی نہیں آتی۔ اسے اس بات کا ذرا برابر بھی ڈر نہیں کہ اسے کام سے ہٹا دیا جائے گا۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ کوئی دوسری بھنگن اس کی جگہ کام کرنے کو تیار نہیں ہوگی، اگر ہو تو ناخنوں سے پھاڑ کھائے ہم نے اس کا نام چاچی تاڑکا رکھ چھوڑا ہے۔

گذشتہ ہولی کے روز چاچی تاڑکا نے جی بھر کر شراب پی۔ گھونٹ گھونٹ بچوں کو بھی پلائی اور انھیں ساتھ لے کر رات بھر ناچتی رہی جو جی میں آیا بکتی اور چلاتی رہی کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اسے منع کرے۔

چاچی تاڑکا تین بچوں کی ماں ہے۔ سب سے بڑا لڑکا ہے۔ عمر سات آٹھ سال ہے۔ جب وہ شرارت کرتا ہے تو چاچی تاڑکا لال لال آنکھیں نکال کر کہتی ہے۔ "حرام کے تخم نچلا نہیں بیٹھتا"۔ ان گھڑکیوں کے باوجود وہ نچلا بیٹھنے کا عادی نہیں۔ جب چاچی تاڑکا گھر پر نہ ہو تو چھوٹی بہن کا سر بازوؤں میں لے کر کھینچ ڈالتا ہے

اور اسے چلاتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس چھوٹی لڑکی کی عمر چار ایک سال سے ڈیڑھ دو سال کی اور موٹی سوکھی سی بچی چاچی تاڑ کا کی گود میں ہے۔ جب چاچی تاڑ کا اُسے اپنے پیٹ پر بٹھائے گلی میں لیٹی ہوتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھینس کے جسم پر مینڈک بیٹھا ہے۔

ایک اور لڑکی بتو جس کا دس بیس روز میں بیاہ ہونے والا ہے۔ وہ چاچی تاڑکا کی لڑکی نہیں اس کے خاوند کی لڑکی ہے پہلی بیوی سے پیدا ہوئی تھی۔ خاوند بیچارے کی اہمیت اتنی بھی نہیں جتنی گھر میں بیٹھ کر حقہ پینے والے جمعدار کی شاید اس لئے کہ وہ میونسپلٹی کا ملازم نہیں۔ شاید اس لئے کہ چاچی تاڑکا نے اس کی کسی بات پر فخر نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ چاچی تاڑکا کا کردار جمعدارنی سے نمایاں ہے اور وہ اس کے پیچھے بالکل چھپا رہتا ہے۔

لیکن بتو ایک ابھرتے ہوئے کردار کی مالک ہے۔ وہ چاچی تاڑکا کے پیچھے چھپنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اکثر ہمارے ہاں صفائی کرنے آیا کرتی ہے میں نے ایک دفعہ اس سے کہا تھا کہ جمعدارنی تو نہیں مانتی خدا کے واسطے تمھیں جلد آجایا کرو ہمیں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بتو نے جلے جی سے کہا تھا۔ "میرے بس کی کیا بات ہے۔ میں تو گولی ہوں اس کی"

اور پھر اس نے جن آنکھوں سے میری طرف دیکھا تھا ان میں دردناک داستان بھری ہوئی تھی۔ بتو کا چہرہ پتلا دبلا اور قدرے تر چھا ہے۔ لیکن آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ ان میں کوئی عجیب جادو ہے جو ان آنکھوں ہی کو نہیں بلکہ بتو کو بھی حسین بنا دیتا ہے۔ جب وہ انھیں پورا کھول دیتی ہے تو جی چاہتا

ہے کہ آدمی انھیں دیکھتا ہی جائے۔ ان میں ڈوب کر اس داستان کا راز معلوم کر لے۔

ڈیڑھ دو ماہ پہلے بتو کے ساتھ ایک لڑکا اندر آیا کرتا تھا وہ دونوں مل کر گھروں میں صفائی کرنے جاتے تھے اس وقت ہماری اس بلڈنگ میں آبادی اتنی گنجان نہیں تھی۔ عورت کوئی نہ تھی سب مرد تھے وہ کام پر چلے جاتے تھے میں اپنے کمرہ میں بیٹھا لکھا پڑھا کرتا تھا۔ میرے ہاں وہ باورچی ہوتا تھا۔ وہ دونوں خوب چہل بازی کیا کرتے تھے۔ ہماری کھلی چھت پر اچھلتے کودتے تھے کبھی بتو آگے ہوتی تھی اور اندر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا تھا اور کبھی اندر آگے بھاگتا تھا اور بتو اسے مارنے دوڑتی تھی۔ باورچی کھڑا ہنسا کرتا تھا، اور میں چپ بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔

چاچی تارڈکا کو شک ہے کہ بتو سارے محلہ سے عشق لڑاتی ہے۔ وہ اس پر کڑی نگاہ رکھتی ہے اور اسے گھورتی ہے۔ جب بتو خفا ہو کر اس کی طرف دیکھتی ہے تو وہ جل بھن کر ترش لہجے میں کہتی ہے "کیا گھورتی ہے آنکھیں نکال لوں گی اپنی سوت کی۔"

[illegible] آنکھیں نکالنے کا یہ فقرہ میں نے چاچی تارڈکا سے کئی مرتبہ سنا ہے ایک [illegible] تو اس نے سچ مچ آنکھیں نکال لینے کی کوشش کی تھی۔ بتو کو خوب مارا تھا۔ وہ سارا دن ہماری دیوار کے نیچے چبوترے پر بیٹھی روتی رہی تھی اور چاچی تارڈکا کے لاکھ ناراض ہونے کے باوجود کام پر نہیں گئی تھی۔ میں جتنی مرتبہ نیچے اترا اتنی ہی مرتبہ بتو کو وہیں بیٹھے روتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اب زیادہ حسین

تھیں اور ان کی کہانی بھی پہلے سے زیادہ دردناک تھی۔ مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہوئی اور میں نے چاچی تارڑ کا سے کہا۔ "جمعدارنی کیوں مارتی ہو بے چاری کو۔ صبح سے بیٹھی رو رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "بابو جی کیا کروں اپنی دھی بیٹی کے چلن کا تو خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

ہم جس بلڈنگ میں رہتے ہیں وہ اس محلہ میں سب سے اونچی اور شاندار عمارت ہے۔ اس لئے محلّہ کے لوگ اس عمارت میں بسنے والوں کو اونچے اور مہذب سمجھتے ہیں۔ آؤ تمھیں ذرا ان کی بات بھی بتا دوں۔ مجھے تم جانتے ہی ہو۔ ہر محفل میں اپنے مخالفوں سے لڑنا میرا کام ہے۔ لیکن یہاں میں کسی سے نہیں لڑتا۔ کیونکہ یہاں مجھے اپنا کوئی مخالف نظر نہیں آتا۔

میرے بائیں طرف ایک عورت اور اس کی ساس رہتی ہے۔ عورت دیکھنے میں نہایت غیر دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ جیسے اس میں زندگی کے سب سوتے سوکھ گئے ہوں۔ میں نے اسے کبھی خاوند، دیور اور ساس سے ہنس کر بات کرتے نہیں دیکھا بلکہ ان کے سامنے وہ ایسی رہتی ہے جیسے دیوانی ہو۔ ہاں وہ پڑوسن کے بچے کو اکثر کھلایا کرتی ہے۔ اسے خوش کرنے کے لئے منہ ڈھانپ لیتی ہے پھر پلو اٹھا کر "چھاں" کہتی ہے اور مسکرا دیتی ہے۔ عورت کے ہونٹ ڈھیلے ڈھالے اور نیچے کو لٹکے ہوئے ہیں اس لئے مسکراہٹ بھی انھیں جاذبِ نظر نہیں بنا سکتی۔ مگر یہ مسکراہٹ کسی غیر مطمئن اور غیر فانی جذبہ کی ترجمان معلوم ہوتی ہے۔

عمر چالیس سال سے تجاوز کرنے کو آئی لیکن اس کے اپنا کوئی بچہ نہیں۔ شاید اسی لئے وہ ساس کو اچھی نہیں لگتی۔ روز کے جھگڑے نے اس کا جینا اجیرن بنا رکھا ہے

چند روز سے اس نے ساس کی لڑائی سے تنگ آکر اپنا کھانا پکانا الگ کر لیا ہے
بائیں طرف سامنے جو کمرہ ہے اس میں ایک بوڑھا اور اس کا کنبہ رہتا ہے
دراصل اس کنبے کو بوڑھے کا کنبہ کہنا بجا نہیں۔ بلکہ وہ اس کنبہ کا بے کار فرد ہے۔
دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں اور ان کی ماں ہے۔ بڑا لڑکا ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ
ہے۔ سوا سو روپے تنخواہ ملتی ہے جس سے اتنے بڑے کنبے کا خرچ چلنا ممکن نہیں۔ اس لئے
ماں کو فکر رہتی ہے کہ اسے برتن مانجھنے، کپڑے دھونے یا اس قسم کا کوئی اور کام مل جائے
جس سے بیس تیس روپے ماہوار بن جایا کریں اور گھر کا خرچ اچھی طرح چلنے لگے۔ جب
وہ اپنے گاؤں میں ہوتی تھی تو اسے کام اکثر مل جایا کرتا تھا۔

میں ایک بات کہنا بھول گیا۔ اس عمارت میں جتنے لوگ رہتے ہیں وہ سب فسادات
کے بھگائے ہوئے ہیں۔ یہ عمارت کسی مسلمان تاجر کی تھی جو کافی امیر تھا اور یہ خاتون
جو نیچے گلی میں رہتی ہے اس کے ہاں کام کرتی تھی۔ وہ خود پاکستان چلا گیا ہے اور
خاتون کو ابھی تک دس پندرہ روپے مہینہ وظیفہ بھیجتا ہے۔

یہ کنبہ صوبہ سرحد سے آیا ہے۔ وہاں گھر کا سب خرچ بڑھیا کو خود چلانا ہوتا تھا
کیونکہ اس کا یہ بڑا لڑکا ایک سیاسی پارٹی کا بڑا سرگرم کارکن تھا وہ سارا وقت اس
کے لئے وقف کرتا تھا اور اکثر گھر نہیں آتا تھا۔ لیکن اب گھر کی حالت دیکھ کر کسی سیاسی لیڈر
کی سفارش سے ملازم ہو گیا تھا۔ اس بوڑھے نے ساری عمر کبھی کام نہیں کیا۔ وہ وہاں
بھی بے کار رہتا تھا۔ یہاں بھی بے کار رہتا ہے۔ ہر وقت اسٹریچر نما چارپائی پر لیٹا
لیٹا کھانسا کرتا ہے۔ مجھے یہ کھانسی بھیانک اور خوفناک معلوم ہوتی ہے جیسے اس کے
پیچھے وسیع کھوکھلا پن ہے ایک تھکی ہوئی روح کا کھوکھلا پن۔

گھر والوں نے سوچا تھا کہ وہ بازار میں بیٹھ کر سبزی بیچ آیا کرے۔ دو چار آنے روز تو لائے گا۔ بے کار بیٹھنے سے اچھا ہی ہے۔ پہلے دن جو بھنڈیاں لا کر دی تھیں وہ گھر میں پڑی سڑ گئیں۔ بوڑھا پانچ منٹ بازار میں بیٹھ کر اُٹھ آیا اور کہا۔ یا مجھ سے نہیں بکتیں۔ جب وہ خود کام کرنا نہیں چاہتا تو کسی کا کہنا سننا فضول ہے۔ گھر والے کڑھ کر رہ گئے۔ بزرگ آدمی ہے۔ کھانا تو دینا ہی پڑتا ہے۔

بوڑھے کی بڑی لڑکی گو ماں بیاہی ہوئی ہے۔ اس کا داماد بھی یہیں رہتا ہے وہ کسی لکڑی کے کارخانہ میں ملازم ہے۔ کرسی میزوں پر پالش کرنے کا کام کرتا ہے اور ساٹھ روپے مہینہ تنخواہ ملتی ہے۔ میاں بیوی چھت پر برساتی میں رہتے ہیں کل کسی بات پر جھگڑا ہو گیا وہ طیش میں آ کر بڑے زور زور سے کہہ رہا تھا۔ "میں برداشت نہیں کر سکتا کہ عورت مرد کا سامنا کرے۔ اس سے اچھا ہے کہ آدمی مر جائے۔"

اس آدمی کا نام گوردास رام ہے۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو میں تمہیں اس کا نام نہ بتا سکتا۔ اتنے دن یہاں رہتے ہوئے گزر گئے لیکن اس سے کوئی واسطہ نہیں پڑا جیسے وہ یہاں رہتا ہی نہ ہو۔ صبح کام پر جاتا ہے۔ رات گئے لوٹتا ہے۔ اتوار کو چھٹی ہوتی ہے تو میاں بیوی اوپر برساتی میں بیٹھے رہتے ہیں۔ تم جانتے ہو ہمارے سماج میں جو آدمی زیادہ شریف ہو اسے گائے کہتے ہیں۔ یہ گورداس رام سچ مچ گائے ہے۔ کم از کم میں اسے گائے سمجھتا تھا۔ اس کا نام جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ صبح سر جھکائے جاتا ہے اور شام کو سر جھکائے آتا ہے۔ میں نے کبھی اسے بات کرتے نہیں سنا۔ جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔

مجھے گمان بھی نہ ہوا تھا کہ اسے طیش آ سکتا ہے۔ لیکن اس وقت اس کی آنکھوں

سے شعلے برس رہے تھے اور ہونٹ کانپ رہے تھے گو ماں سہمی ہوئی کونے میں کھڑی تھی وہ بے چاری کبھی کبھی نہیں بولتی۔ ہر وقت کام میں مصروف رہتی ہے۔ جی جان سے اس گائے کی سیوا کرتی ہے۔ میں نے سمجھا بجھا کر گورداس رام کو ٹھنڈا کیا وہ کھانا درمیان میں چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر کھانے بیٹھ گیا۔ لیکن لقمہ منہ میں ڈالنے سے پہلے اندر سے مواد خارج کرنا ضروری تھا۔ وہ بڑبڑایا: "سارا دن ادھر جان کھپاتے مر جاتے ہیں اور ادھر یہ چین لینے نہیں دیتی۔"

یہ ماحول ہے اور یہ لوگ ہیں۔ اس گلی ہی پر منحصر نہیں۔ سارے محلے میں ایسا ہی مواد بھرا پڑا ہے جو ہر وقت لاوے کی طرح ابلتا رہتا ہے۔ اور ابل کر باہر آنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ پرے گلی کے نکڑ پر حنیف میاں کی دوکان ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں ادھر سے گذر رہا تھا تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک برقعہ پوش عورت جو بغل کی گلی سے سودا خریدنے آئی تھی کسی لمبے قد کے ڈاڑھی والے مرد سے لڑ رہی تھی اور مغلظ گالیاں دے رہی تھی۔ اتنے لوگوں کے سامنے بے عزتی ہوتے دیکھ کر مرد نے کہا۔ "زبان سنبھال رکھو ورنہ۔"
"چھوکری کے یار، ورنہ کیا۔ ڈاڑھی نوچ لوں گی سور کی۔" وہ گالی بکتی ہوئی بڑھی۔ اور مرد ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ عورت کے دانت پان چباتے چباتے سیاہ ہو گئے تھے اور چہرا بھدّا اور کرخت تھا۔ گالیاں دیتے ہوئے وہ چاچی تاڑکا سے بھیانک نظر آتی تھی۔

صرف چند ایک کمسن بچّے ہیں جو ننگے بدن ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ اور ماحول سے بے نیاز ہو کر رومانی فلمی گانے گاتے ہیں۔ گانے جوان کی زبان پر

چڑھ کر بالکل غلط اور مبہم بن جاتے ہیں مثلاً ابھی ایک لڑکا گاتے ہوئے نیچے سے گذرا ہے
"افسانہ کہہ رہی ہوں دلِ انتظار کا"۔ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ یہ دلِ انتظار کیسی
ترکیب ہے۔ کیا مطلب ہے؟ پھر خیال آیا کہ اس نے دل بیقرار کو دل انتظار بنا دیا
ہے۔ بہرکیف گیت کی رنگینی برقرار رہتی ہے۔ دراصل دل بے قرار بھی تھا اور اسے
کسی شے کا انتظار بھی تھا۔

تحریک آزادی

شروع شروع میں میں نے کوشش کی کہ ان بچوں کی طرح ماحول سے بے نیاز ہو کر پڑھنے
لکھنے میں مصروف رہوں۔ لیکن ماحول سے بے نیاز ہو کر تو گوردا س رام بھی نہیں رہ سکتا جو
گرائے ہے۔ پھر میرے لئے بقول تمہارے جس کی باغی روح کہیں چین نہیں لینے دیتی ایسا کیسے
ممکن تھا؟ ماحول میرے تخیل پر اثر انداز ہو رہا ہے اور میرا تخیل ماحول پر اثر انداز ہونے کی
کوشش کر رہا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا ہے۔ میں سوچتا رہتا
ہوں اور خلا میں تیرتا رہتا ہوں۔

کیا بتاؤں اس سوچنے اور تیرتے رہنے میں کیا مزا ہے عجیب عجیب خیالات ذہن میں
اٹھتے ہیں میں اکیلا تو نہیں، ہزاروں حسرتیں اس خلا میں تیرتی رہتی ہیں۔ یہ حسرتیں انسانی روحوں کے
ٹکڑے ہیں۔ یہ زندہ ہیں، مجھے ان پر پیار آتا ہے اور میں انھیں اپنے پاس بلاتا ہوں۔ ہمدردی اور پیار
کی بھوکی روحیں مجھے اپنے دل کا راز سنانے لگتی ہیں۔ ان کی بات سن کر مجھے ایک غیر معمولی قوت کا
احساس ہوتا ہے جیسے میرے اندر کوئی عظیم شے ابھر رہی ہو اور میری ہستی انجانی اونچی بلندیوں کی طرف پرواز
کرنا چاہتی ہو لیکن ایک گہرا اور مضبوط خول اس حسرت کی تکمیل میں مانع ہو۔

میں ہر روز یونہی سوچتا ہوں۔ یونہی خلا میں تیرتا ہوں اور یونہی محسوس کرتا ہوں لیکن آج صبح جب
ان لڑکوں کی ہاہو سے سارا ماحول جاگ اٹھا تو مجھے یکایک ایک دھچکا سا محسوس ہوا جیسے خول ٹوٹ
گیا ہو۔ دبی گھٹی انسانیت پھیل گئی ہو اور اس کی عظمت نئی بلندیوں کی طرف پرواز کر رہی ہو۔

تحریک